دلّی کی شام

احمد علی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

20:02
rekhta.org/ebooks/
دلّی کی شام

دلّی کی شام
احمد علی
ترجمہ
بلقیس جہاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
اشتراک
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

2
427

حصّہ سوم

عالم عالم عشق و محبت دُنیا دُنیا تہمت ہے

دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

—— میر تقی میر

۱

اِدھر شہر میں دربار کی دھوم دھام ٹھنڈی پڑی اُدھر میر نہال کے گھر میں اصغر کی شادی کی چہل پہل دونی ہوگئی۔ اب محض بیس ایک دن باقی رہ گئے تھے کہ مہمان آنے لگے۔ صبح سے شام تک کہاڑ "اماں جی سواری اترو الو" کی آوازیں لگاتے رہتے اور رشتہ کنبہ کے علاوہ سمدھیانے والیاں، منہ بولی چچی پھوپیاں اپنے کُٹم کے کُٹم لیکر ڈولیوں سے اُترتیں۔

جمال بیگم کے کوٹھے سے لے کر مردانے تک سارا مکان کھچا کھچ بھر گیا اور جب اس میں سمانے کی جگہ نہ رہی تو پڑوس کا گھر بھی مانگے کو لے لیا اور دونوں گھروں میں اوپر تلے مہمان بھر گئے، اور یہ حالت ہوئی کہ تیرے اوپر میں، اور میرے اوپر تو۔ رات کو زمین پر پڑاؤ لگتا تو کسی کا سر اور کسی کی پائینتی ہوتی۔ کھانے دانے کا انتظام شرف اللہ کے سپرد ہوگیا جو کلیم بیگم کے ماموں زاد بھائی تھے۔ چنانچہ باہر کے باہر ہی کھانا پکتا۔ جنس کا تولنا تلوانا اور باورچیوں کو دینا دلانا سب وہی نمٹتے۔ اِدھر دیگیں تیار ہوئیں اُدھر وہ پیڑھی بچھا کر آستینیں چڑھا بیٹھ جاتے اور تار الگ اُتار کے رکھ دیتے

اور کفگیر سے سالن نکال نکال کے لاکھی پیالوں میں دو دو بوٹی دو دو آلو کے قتلے دھر
اوپر سے تار ڈال خوانوں میں لگوا دیتے۔ پہلے مردانے میں کھانا کھلوا دیا جاتا، پھر
زنانے میں۔ صدر دالان میں یہاں سے وہاں تک اشعار لکھے ہوئے لال دسترخوان
بچھ جاتے اور سالن کے پیالے اور خمیری روٹیاں چن دی جاتیں، اور سب بیویاں
کھانے پر بیٹھ جاتیں۔ آپس میں ہنسی ٹھٹھا چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی ہوتی۔ بچے
شور مچاتے۔ بڑی بوڑھیوں میں سے ایک ایک کڑی آوازیں دیتے مگر ان کی کوئی سنوائی
نہ ہوتی۔ اگر کسی بچے کو پکڑ دھکڑ کر قاصد بنا کر بھیجا تو وہ بھی غائب۔ اب حشر تک باہر
کھڑے گلے پھاڑا کرو، ڈھول بھی پیٹ ڈالو تو خبر نہ ہو۔ بھلا عورتوں کو باہر کی آوازوں
پر کان دھرنے کا ہوش کہاں باقی تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر وہ اپنی اپنی دلچسپ مصروفیتوں میں مشغول
ہو جاتیں۔ کوئی بچوں کے کپڑے سجل کر رہی ہے تو کوئی زیور کی الٹ پلٹ میں لگی
ہوئی ہے۔ اور پھر باتیں کرنے کا یہی موقع بھی تھا۔ اب شادی بیاہ کے دنوں میں
بھی فرفر زبان نہ چلے گی تو اور کونسا دن آئے گا؟ ساس بہویں، ماں بیٹیاں، سب
یکجا تھیں۔ اور سب کو اپنی اپنی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ سہاگنیں اپنی شادی کے دن یاد
کر کے جو کچھ پایا تھا کے جوڑوں کی باتیں کرتیں۔ مائیں اپنے بیٹوں کے لیے لڑکیوں کو
بہو بنانے کی نظر سے تاڑتیں اور آپس میں کانا پھوسی ہوتی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی
سنا دیا جاتا کہ بیٹیوں کا جہیز کتنا مکمل ہو چکا اور کیا کیا بنانا باقی تھا۔ وہ بڑھیاں
جو پھونس ہو گئی تھیں ان کو بھی اپنی جوانی یاد آتی اور وہ بھی اپنے جہیز اور چڑھاوے کی
ایک ایک سوئی اور تلے دانی سے لے کر زیور اور چھپر کھٹ کے ذکر اسی جوش و کیفیت
سے کرتیں حالانکہ وہ سب عزیز اثاثے بیٹیوں کے جہیز اور بہوؤں کے چڑھاوے
میں کب کے نیگ لگ چکے تھے۔ نہیں تو پھر اوروں کے زیور کپڑوں پر نکتہ چینی ہوتی۔

دلّی کی شام

اپنے کپڑے ایک دوسرے کو دکھائے جاتے، پسند کیے اور کروائے جاتے۔ اور پھر آپس میں صلاح مشورے کرتیں کہ اصغر کی برات والے روز کونسا جوڑا پہنیں اور کونسا چوتھی والے دن۔ اور بچّے تھے کہ چیاؤں میاؤں کرتے اور آ کے اوسان جاتے رہتے۔ مگر اسی ہائے توبہ میں اُن کے کام پورے ہوتے جاتے۔ رنگوں کے میل ملانے، چھپکے بالے، چوہے دنتیوں اور پری بند کی باتوں میں وقت گزرتا معلوم ہی نہ ہوتا۔

آخر جس نیک گھڑی کے لیے بیویوں نے یہ ساری تیاریاں کی تھیں وہ بھی آپہنچی۔ نکاح سے (تین) روز پہلے ظہر کے وقت سے سانچق کی ہا بڑ تا بڑ پڑ گئی۔ وحیدہ بیگم نے کوٹھڑی کھول کر رنگین کاٹھ کے صندوق میں سے چڑھاوے کے سارے جوڑے نکالے۔ کہنے کو تھے تو کل گیارہ مگر سب کے سب بھاری اور تلوواں ۔ زربفت اور کمخواب کے پیجامے، گلبدن کے کرتے اور دوپٹے، کسی پر مقیش کے ماہی پشت کا جال! اور کسی پر گوکھرو کی دبکیت بھولی کی بیل، کسی پر دھنک کی چھڑیاں اور کسی پہ کیری کی ترنج۔ زیور بھی دوہرا تہرا تھا، سادہ کاری اور کندن، نورتن اور سنارہی الگ۔ گلے میں گلوبند اور چمپا کلی اور چندن ہار، ہاتھوں میں نوگریاں اور جوشن، بازو بند اور پہونچیاں کانوں میں مگر چودانیاں، کرن پھول اور بالی پتے، پیروں میں جھانجن اور پازیب، ناک کی نتھ اور سر کا جڑاؤ جھومر اور سیس پٹی۔ وحیدہ بیگم نے سب کو چڑھاوا دکھا دکھا کر لکڑی کے ہشت پہل خونوں میں سجوا دیا، اور اوپر سے کھیلیں اور مرمرے ڈال جھک جھمک کرتے ہوئے پٹاپٹی کے خوان پوشوں سے ڈھنک کر شرف اللہ کے حوالے کر دیئے۔ بیگم جمال حسبِ معمول ہدایتیں دینے لگیں:

"اے منجھلی دُلہن بی چھوڑو ننّے کو۔ وقت ہوا جا رہا ہے، اور ابھی تک کسی نے سہاگ پڑے کی خبر بھی نہیں لی۔" اور وہ خود سہاگ پُڑا اپنے سامنے چاندی کی سینی میں سنگوانے لگیں۔

باہر گلی میں ڈولیاں کبھی کی آئی کھڑی تھیں۔ ڈیوڑھی میں سے شرف اللہ کی آواز آ رہی تھی: "ارے بھئی جلدی کرو۔" بچے بالوں کو سنبھالتی ہوئی بیویاں سوار ہونی شروع ہو گئیں۔

"ارے بی دولہا کی ناں کہاں ہیں؟ انھیں تو بلاؤ!"

بیگم نہال جلدی جلدی نیگ کے روپے کوٹھڑی میں سے نکال کر لال تھیلی میں باندھ رہی تھیں۔ جب ڈھونڈیا پڑی تو نکل کے آئیں۔ مارا مار کرتے کرتے بھی مغرب کے بعد گھر سے روانگی ہوئی۔

دولہا والیوں نے بلقیس کا منہ مصری سے میٹھا کیا۔ بیگم نہال نے بسم اللہ کر کے پہلے جھومر لگایا پھر سہاگنوں نے مل کر باقی کا زیور بھی دلہن کو پہنا دیا۔ اور ڈومنیاں گلے پھاڑ پھاڑ کے سہاگ گھوڑیاں گاتی رہیں۔ رات کے ساڑھے نو بجے دلہن کے ہاں سے واپسی ہوئی۔ ادھر ڈولیوں سے قدم ڈیوڑھی میں رکھتے ہی باتوں کے وہی طومار شروع ہو گئے۔ اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں اور نئے سمدھیانے پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں یا تعریفوں کے پل باندھے جانے لگے۔ ابھی دسترخوان بچھا ہی تھا کہ دلہن کے ہاں سے دولہا کے واسطے مایوں کا سامان آ گیا اور بیویاں کھانا چھوڑ چھاڑ ایک ایک چیز ہاتھوں میں لے لے کر دیکھنے لگیں۔ بڑھیاں جن کی بینائی کم تھی مگر دیکھنے کا شوق زیادہ تھا ہر چیز کو آنکھوں کے قریب لا لا کر ٹٹول ٹٹول کر گھور رہی تھیں۔ جب صابن دانی پر نظر پڑی تو ایک بولیں:

"اوئی بوا یہ کیا بلا ہے؟"

"اے بی ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

"اے ہے کیا ہے بی؟ یہ عمر ہونے آئی میں نے تو کبھی دیکھی نہیں۔"

وحیدہ بیگم نے کہا:

"خالہ جان، صابن اور صابن دانی ہے۔"

"بوا یہ کیا ہوتی ہے؟ آج ہی نام سنا ہے؟"

"بازار میں ہاتھ منہ دھونے کی ولایتی ٹکیاں بکنے لگی ہیں۔ یہ وہ ہیں۔"

"ہے ہے بی پرے رکھو۔ موئے بدجانور کی چربی ہوگی۔ غارت کرے ان فرنگیوں کو دین دھرم سب اکارت کردیا۔ ایسے شیطانی کام ہیں کہ شیطان بھی ان کے آگے کان پکڑلے۔"

"نہیں آپا جان! ہے تو بہت پیاری۔ میں بھی اپنی رشو کے لیے ایسی ہی خریدونگی۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ان ہی باتوں اور کھانے پینے میں ساڑھے گیارہ بھی بج گئے۔ ابھی تک دلہن والے نشان لے کر نہ آئے تھے اور ڈیڑھ دو سے پہلے آتے ہوئے نظر بھی نہ آتے تھے۔ احمد وزیر، اصغر کو نہلا دھلا کر فارغ ہوچکا تھا اور اس وقت غفور کے پاس بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ احمد وزیر جدّی نائی تھا اور اس کی پیڑھیاں میر نہال کی ڈیوڑھی پر گزر گئی تھیں، غفور بھی اپنے جامے میں نہ سماتا تھا۔ شیخ محمد صادق نے رشتہ طے کرلیا تھا اور بہت سارا جہیز دینے کا وعدہ کرکے بھڑے پر چڑھا دیا تھا۔

حقہ کا دھواں چھوڑ کر احمد وزیر اپنی چھدری ڈاڑھی کی لمبی نوک کو بل دیتے ہوئے غفور سے بولا:

"کیوں، کب ہو رہی ہے؟ ہم سے نہ چھپا ظالم۔ ہم یار ہیں یاروں کے۔ ایسی چھانٹی چودہ برس کی، خدا کی قسم قسمت کا سکندر نکلا۔ میری گھروالی کہہ رہی تھی بڑی خبصورت ہے۔ یہ سن کے رال تو میری بھی ٹپکنے لگی۔"

غفور مزا لیتے ہوئے کہنے لگا:

"میری جو' نیا کا سن کے اپنی بڑھیا یاد آ رہی ہے؟"

"ابے کھوسٹ نہ کہہ۔ دوسری کی ہے۔ ایک کو تو کھا بیٹھا۔ ابھی تو پٹھوری ہے۔ بڑی جان ہے دسری لگی۔ ذرا جن بھر بچے اور دیدے پہ یار اب تو اپنی ہی کمر جواب دے گئی کل رات کو جب میں گھر پہنچا تو سولہ سنگھار کیے بارہ ابرن سے درست چکنی چپڑی جوبن بنائے بیٹھی تھی۔ میں نے جو مکھڑا دیکھا تو رہا نہیں گیا اور میں بولا؟ ادا مار ڈالیگی جانی تمہاری یہ ادا ایسا مڑک کے بولی: "آگ لگے جو بیس گھڑی تم یہی باتیں کرتے رہتے ہو۔ ذری اتنا نہ ہوا کہ دو کوڑی کا تیل لے کے کبھی گھر میں گھسو۔ ہمسائی کا میاں روز شام کو گجرے لے کے گھر میں آتا ہے۔ مہک ہماری چھت تک آتی ہے۔ مگر ہمارا مقدر کہاں ہے!" یہ کہہ کر احمد وزیر ہنسا اور اس کے بدنما دانت نمایاں طور پر زرد نظر آنے لگے: "بس یار میں وہیں داؤں سمجھ گیا۔ خدا کی قسم وہیں تو ٹال گیا۔ پٹ دینا اپنا تہمت سمیت دروازے کے باہر۔ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ جانو مٹرا اور فتر کا ہوا۔"

اس پر غفور بولا:

"پھر یار کس دن کام آئیں گے؟ جان تو ڑی حاضر ہے۔ بچے تیرے ہی کہلائیں گے میں حق نہیں جتاؤں گا۔"

احمد وزیر نے کہا: "جو تری جنکائے گا؟" غفور آنکھ مار کے بڑے نخرے سے بولا:

"تو نے ہمارے کس بل دیکھے ہی نہیں یار۔ ہم تو چوکڑی ہکانے والوں میں سے ہیں۔ بھیج کے تو دیکھ۔ انجر پنجر ڈھیلے نہ کر دوں تو بات نہیں۔"

"استاد اپنی اپنی گھوڑی اپنی اپنی ران تلے ٹھیک ہے۔ میں وِس کی منہ زوریاں خوب جانتا ہوں۔ جو تو دو دو لے کے چلا اور کہیں ٹکرا گیا اور گاڑی الٹ گئی پیارے تو میں اکیلا جنا ایک وقت میں دو دو کو کیسے سنبھالوں گا؟"

یہ کہہ کر احمد وزیر نے غفور کے کہنی ماری اور دونوں کھِل کھلا کر ہنس پڑے۔

دلچین بھی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ اب ساٹھ سے اوپر ہو گئی تھی اس کا پوپلا منہ ہر وقت ہنسی سے کھلا رہتا۔ دانت جھڑ گئے تھے اور ستواں سی ناک اور ٹھوڑی میں کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ اس وقت وہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور مسرور تھی۔ کسی کے سر پر سے ٹوپی چھین کر اتار لی اور کسی کی اچکن پہن توے کی سیاہی سے مونچھیں بنا پوری مرد بن گئی اور طرح طرح کی نقلیں اتارنے لگی۔ سب اس کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور بیچ بیچ میں اسے چھیڑتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دلچین کو ٹھٹے مٹکا کر ناچنے لگی۔ عجیب عجیب مضحکہ خیز صورتیں بنائی۔ سارے گھر میں ایک ایک کے پاس جاتی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ ہیجڑوں یا شہدوں کی طرح ایک آنکھ میچتی اور دوسری آنکھ مارتی۔ گانے میں اس کی آواز کہیں جاتی اور نظر کہیں ہوتی اور ہاتھ کسی اور طرف اٹھتے۔ آج اس نے بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ مذاقیہ حرکتیں کیں کہ دیکھنے والوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا، ان کی پسلیاں دکھنے لگیں اور سانس پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ ناچنے گانے کی ذہنیت ایسی سوار تھی گویا نشے میں ہے اور وہ پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر منہ بناتی تھرکتی اور ناچتی ہوئی جاتی اور آخر میں سب کے ساتھ مل کر خود بھی ہنسنے لگی اور ایسا ہنسی کہ ہنستے ہنستے تھک کر اس کی چندی آنکھوں میں آنسو ابھر کر بہنے لگے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ادھر ڈومنیاں اپنی پوری قوت سے گا رہی تھیں۔ ان کے گلوں کی رگیں پھول پھول کر گل پھکنے کی طرح پھولتیں اور پچکتیں۔ آوازیں مشرق کو جاتیں تو گت مغرب کو۔ ڈھول کی ڈھمک ڈھمک نے گھر کو آسمان پر اٹھا رکھا تھا۔ نہ کوئی سُر تھا نہ تال، اس پر عورتوں کے فلک شگاف قہقہے اور بچوں کی چیخ پکار۔ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ مگر خوشی کا موقع تھا اور شادی پھر شادی کس طرح کہلاتی۔

ڈیڑھ بج چکا تھا۔ دلہن والے نشان لے کر آن پہنچے۔ بیویاں سب ہنسی ٹھٹھا چھوڑ چھاڑ دروازوں کی اوٹ اور چھت پر سے دلہن والوں کو جھانکنے لگیں۔ مرزا شہباز بیگ خود تو نہ آئے تھے، دلہن والوں کی طرف سے بندو، اشفاق اور میر اعجاز حسین اشفاق کے بڑے بھائی آئے تھے۔ میر اعجاز حسین بہت سنجیدہ اور دیندار قسم کے بزرگ تھے۔ ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں کی تسبیح کٹا کٹ پھیر رہے تھے۔ وہ بار بار کھنکھارتے اور اٹھتے بیٹھتے وقت بہ آواز بلند یا رسول اللہ کہتے۔

اصغر کو بدّھی اور انگوٹھی پہنانے کے بعد میر اعجاز حسین نے دولہا کو اکیس گیارہ روپیہ سلامی دی۔ پھر بندو نے اصغر کے منہ میں پان اور مصری کی ڈلیاں رکھنی شروع کیں۔ ایک پان منہ میں نہ جاتا کہ وہ دوسرا منہ میں رکھ دیتا۔ اس رسم میں میر اعجاز حسین کا بیٹا چنّو اور دوسرے نوجوان بھی شامل تھے۔ اصغر چپکے چپکے پان اور مصری رومال میں چھپا لیتا۔ جب اس مذاق کو بہت دیر ہو گئی اور اصغر والوں کی طرف سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو حبیب الدین نے چپکے سے شرف اللہ کے کان میں کہا:

"تم لوگ خاموش کیوں بیٹھے ہو؟ دلہن والے آسانی سے بچ کے نہ نکل جائیں!"

جب دلہن والوں کے لیے شربت آیا اور میر اعجاز حسین ختم کر چکے تو منہ پچھائی شروع ہوئی۔ شرف اللہ نے اٹھ کر ان کا منہ زور زور سے پونچھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر تو وہ چپ رہے کہ وہ رسم پوری کر کے چھوڑ دیں گے مگر شرف اللہ شد و مد سے پونچھنے لگے۔ میر اعجاز حسین ایک دو دفعہ زور سے کھنکھارے اور اپنے کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر شرف اللہ کہاں سننے والے تھے۔ میر اعجاز کا سر ایک ہاتھ سے پکڑ اپنی پوری طاقت سے ان کے ہونٹ رگڑنے لگے۔ میر صاحب کی ڈاڑھی بکھر گئی۔ تسبیح ہاتھ سے چھوٹ کر الگ گری اور ٹوپی اتر کر دور جا پڑی۔ میر اعجاز معذوری سے اپنے کو چھڑانے کی

کوشش کر رہے تھے اور گھٹی ہوئی آواز میں چلائے: "یا رسول اللہ حق اللہ!"

لیکن کشتم کشتا میں ان کے ہونٹ اور چھل گئے۔ یہ منظر کچھ ایسا عجیب تھا کہ سب قہقہہ لگانے لگے۔ باپ کی یہ درگت بنتے ہوئے دیکھ کر چنّو کا پارہ گرم ہو گیا اور دلہن والے سمجھے کہ یہ ان کی توہین ہو رہی ہے۔ حبیب الدین کو خیال آیا کہ مذاق حد سے بڑھ گیا ہے اور کہنے لگے:

"چھوڑو شرف اللہ اتنا مذاق اچھا نہیں کوئی تمہاری عمر کے ہیں؟"

شرف اللہ نے ان کو چھوڑ دیا اور میر اعجاز حسین یا رسول اللہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور اپنی تسبیح اور ٹوپی اٹھانے لگے۔ ان کے ہونٹ چھل گئے تھے اور ان کی آنکھوں میں تکلیف، غصّے اور خفت سے آنسو آ گئے۔

بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اشفاق غصّے سے بولے:

"واہ جناب یہ بھی کوئی شرافت ہے؟ آپ ہیں کس ہوا میں۔ میرے خسر آپ سب کو خرید سکتے ہیں۔"

اس پر شمس کو بھی تاؤ آ گیا اور بگڑ کر کہنے لگے:

"آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ دولت کا گھمنڈ کسی اور کو دکھائیے گا۔ ہم دولت کو ٹھوکروں میں اُڑاتے ہیں۔ ہوں گے رئیس تو اپنے گھر کے۔"

اصغر دل ہی دل میں کٹا جا رہا تھا۔ بلقیس کی وجہ سے دلہن والوں کی ذلت کا خیال اذیت دہ تھا لیکن خون کے جوش سے اپنوں کی طرفداری کا جذبہ تھا۔ ان کو بھی اوچھے جملے کہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن حبیب الدین عقلمند تھے اور انھوں نے معاملہ کو آگے نہ بڑھنے دیا۔

جب دلہن والے رخصت ہو گئے تو اصغر کو مایوں بٹھایا گیا۔ دالان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہنڈوں کی روشنی میں عورتوں کے کپڑے سورج کی

کرنوں کی طرح چمک رہے تھے۔ غل غپاڑے میں کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ جب میر نہال نے پہلی پینڈی اصغر کے ہاتھوں میں رکھی تو خوشی سے ان کا چہرہ چمک اٹھا، لبوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ کو روکنا چاہا لیکن ان کے ہونٹ نیم وا ہو ہی گئے۔ شادی کے ہنگاموں کا اثر لازمی تھا اور وہ بھی اس سے بری نہ رہ سکے۔ عورتوں کے چہرے فرطِ مسرت سے دمک رہے تھے۔ آخر کیسے جان لیوا مرحلوں سے گزر کر تو یہ بیاہ ہو رہا تھا۔ بیٹے کا منہ میٹھا کر کے میر نہال بیٹھک میں چلے گئے تاکہ اور سب لطف اندوز ہو سکیں۔

پھر کیا تھا سب لڑکیاں بالیاں مل کر اصغر کو پینڈیوں کے ٹکڑے کھلانے لگیں کہ دولہا دلہن میں ہمیشہ بنی رہے۔ اصغر سردی سے سکڑ رہا تھا، لیکن اس کا چہرہ کھلا پڑتا تھا۔ اس کی شادی اس ہی لڑکی سے تو ہو رہی تھی جس سے اُس کو والہانہ محبت تھی۔ ساری لڑکیاں اس کے منہ میں زبردستی پینڈیوں کے ڈلے ٹھونس ٹھونس کر سو روپیے نیگ کے مانگنے لگیں اور اصغر دینے سے انکار کرتا رہا۔ میر نصیر الدین کی بیٹی ثریا نے پوری پاؤ بھر کی پینڈی اس کے منہ کی طرف بڑھا کے اپنی بے سُری اور تیز آواز سے چیخ کر کہا:

"اچھا اگر اس کو ایک دفعہ میں کھالیں تو ہم دس روپیے چھوڑ دیں گے۔"

اصغر بولا:

"کیا رکھوا کر بھول گئی ہو؟ بس پچاس سے زیادہ نہیں ملیں گے۔"

سب ایک زبان ہو کر بولیں:

"پورے سو لیں گے"

مہرو بھی کہنے لگی:

"آج تو کنجوسی نہ کیجیے۔ چاند سی دلہن کیا مفت مل جائے گی؟"

سب نے مل کر اصغر کا ناطقہ بند کر دیا۔ اتنے میں جمال بیگم کی آواز آئی:
"اُو ئی لڑکیوں فقیروں کی طرح للک للک کے ہاتھ دھو کر بچے کے پیچھے پڑ گئیں۔ چلو ہٹو۔"

مگر وہ بھی ضد کیے اڑی رہیں اور اصغر نے پچھتر روپے دے کر اپنا پیچھا چھڑایا پھر خالہ پھوپیوں نے اصغر کے ہاتھوں میں چاندی کے روپے اور اشرفیاں رکھنی شروع کیں۔ دلچین نے بھی جھٹ پٹ بلائیں لے کر ملیا چھنکتے ہوئے زر پینہ اصغر کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

اتنے میں اُبٹنے کی دھما چوکڑی شروع ہو گئی اور وہ طوفان بے تمیزی ہوا کہ نہ پوچھو۔ جس کے ہاتھ جو لگا ابٹنے میں سن گیا۔ جیسے ہی بے خیالی میں کوئی لڑکا کسی لڑکی کے منہ پہ ٹھنڈا ابٹنا مل دیتا وہ جھلاتی ہوئی بدلہ لینے اس کے پیچھے دوڑتی۔ پھر تو لڑکے لڑکیوں کے پیچھے اور لڑکیاں لڑکوں کے تعاقب میں اس طرح دوڑنے لگیں کہ سارا گھر اوئی اللہ اور چیخ پکار سے گونج اٹھا۔

"خدا کے لیے چھوڑ دیجئے۔ تو بہ ہے سارے کپڑے ستیاناس کر دیئے۔"

"کیا ہوا بدلی لینا زیادہ پیاری لگو گی۔"

"ہائے میرے اللہ۔ آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ چھوڑ دیجئے نا مجھے۔ اتنی سردی ہے۔" اور وہ اپنے کو چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر مارتی مگر ابٹنا ملنے والا کہیں باز آتا ہے؟ اور لڑکی بیچاری چیخنے چلانے کے باوجود کسمسا کر رہ جاتی اور لڑکا ابٹنا گردن اور منہ اور پیٹھ پر دل کھول کے مل دیتا۔ لڑکی کو مزہ تو ضرور آتا لیکن جھوٹ موٹ ہائے ویلا کرتی رہتی ....

جوانوں کو دیکھ کر بوڑھیاں بھی ترنگ میں آ گئیں اور ابٹنا کھیلنے لگیں —
جمال بیگم ابٹنا لے بیگم نہال کی طرف لپکیں؛

"اے بھابی لو تمہیں بھی ہُل ہلا سوجھا ہے؟ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گئیں۔ اے بی بس مجھے تو بخشو۔"

"کیوں کیا بڈھوں کے دل نہیں ہوتے؟ بیٹے کی شادی روز روز تھوڑی ہوتی ہے؟"

جمال بیگم نے یہ کہہ کر بیگم نہالی کے ابٹنا مَل ہی دیا۔ مردانے میں بھی یہی بھاگ دوڑ اور آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ لڑکوں نے لڑکیوں کے گال مسل مسل کر لال کر دیے، لڑکیوں نے بھی خوب مکّے بھرے۔ کسی نے کاٹا، کسی نے دھپ رسید کیے۔ بال بکھر گئے، کپڑے مِسک گئے اور دوپٹے ڈھلک کر سینوں سے نیچے آ گئے۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔

۲

نکاح والے روز صبح احمد وزیر نے اصغر کو نہلا دھلا کر تیار کیا اور دلہن کے ہاں سے آیا ہوا جوڑا پہنا یا۔ پھر حبیب الدین نے سہرا اور سر پیچ باندھ کر دولہا بنایا۔ کمر میں پٹکا کسا۔ زربفت کی شیروانی اور بنارسی سیلے میں اصغر بہت حسین نظر آرہا تھا۔ جذبات کی فراوانی اور فرطِ خوشی سے اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح ترو تازہ اور شگفتہ ہو گیا تھا۔

برات چڑھنے کا وقت تھا تو دس بجے لیکن مارا ماری کرتے کرتے بھی ساڑھے گیارہ بج گئے۔ جب کہیں خدا خدا کر کے برات چلی۔ گھوڑے پر نیم شہ بالا بن کے بیٹھا۔ اور باقی ڈھائی تین سو براتی ساتھ ہو لیے۔ آگے آگے نفیری اور شہنائیاں بجتی جا رہی تھیں اور دولہا سُرخ ریشمی رومال سے منہ چھپا کے بیٹھا تھا۔

جب برات دلہن کے مکان پر پہنچی اور جیسے ہی دولہا گھوڑے سے اترا تو ایک طرف سے چنّو اور دوسری طرف سے شرف اللہ جھپٹے کہ دیکھیں کون گھوڑے پر پہلے بیٹھتا ہے۔ دونوں نے ایک ایک پاؤں رکاب میں ڈال لیا،

اور دوسرا کاٹھی پر لے جانے کو بیک وقت ساتھ اٹھایا تو بیر زین پر پہنچنے کے بجائے ہوا ہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہ گئے۔ گھوڑا اس معرکہ سے بدک گیا اور دونوں کو گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ وہ تو سائیس ہوشیار تھا گھوڑے کو فوراً قابو میں کر لیا۔ دونوں فریقین کے لوگ ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دینے لگے اتفاق سے جنو بائیں طرف تھا اور دوبارہ جب دونوں اچک کر پھر زین پر بیٹھے ہیں تو جنو آگے اور شرف اللہ ان کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہوئے۔ دلہن والوں نے بڑے فخر و افتخار سے ٹھینگا دکھا کر کہا انہیں ہار گئے۔ دولہا میاں غلام بنے رہیں گے۔ لیکن دولہا والے کہہ رہے تھے کہ دولہن گھوڑے پر ساتھ بیٹھے ہیں آگے پیچھے سے کیا ہوتا ہے لہٰذا پلہ برابر رہے گا۔

آخر ان ہی نے جو فرشتہ خصلت اور ایک عالم و فاضل بزرگ تھے نکاح کے ایجاب و قبول کروائے۔ اور جب [illegible] انھوں نے پوچھا کہ بلقیس جہاں بیگم بنت مرزا شہباز بیگ عمر اٹھارہ سال چار ماہ بعوض مہر پچاس ہزار سکہ رائج الوقت موجل تم کو قبول ہے تو اعجاز کا دل سینہ میں ایک انجانی دھک دھک کرنے لگا۔ اور اس نے دل کی ان ہی بے شمار دھڑکنوں میں بلقیس کو اپنی منکوحہ قبول کر لیا۔ مگر اس نئے بندھن اور زندگی کے اہم ترین فیصلہ کے بعد جہاں سے اس کی زندگی حیات کے نئے رخ پر مڑ جاتی تھی ایک عجیب اور بالکل انوکھا غم اس کے دل کو ملنے لگا۔ وہ اس کیفیت سے اس قدر نا آشنا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دراصل یہ وقت اس کے لیے خوشی کا باعث ہے یا رنج کا۔

اجازت دیتے وقت مرزا شہباز کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور یہ خیال آتے ہی وہ رو دیے کہ آج ان کی عزیز بیٹی پرائی ہو گئی۔ لیکن مبارک سلامت کے غلغلے میں داماد اور خسر دونوں اپنی کیفیتوں کو بھول گئے۔

چھوارے لٹائے گئے، ہار پھول اور پان بٹے۔ ابھی شہد ے اور بھانڈ انعام واکرام کے لیے چلّا رہے تھے "الٰہی دولہا ست پوتا ہو۔ ایک سے اکتھر ہوں" کہ مہمان اُٹھنے لگے اور پھاٹک سے نکلتے ہوئے ہر ایک کو لال رومال میں بندھی ہوئی تانبے کی چپٹی ہوئی طشتریوں میں گوٹا اور مٹھائی بیٹی کی گئی اور وہ بن بلائے مہمان جو اپنے ساتھ کئی کئی بچے لے کر آئے تھے کئی کئی حصے سمیٹ کر خوش وخرّم چلے گئے۔ کچھ ابھی تک جوتیاں تلاش کر رہے تھے۔ اس ہڑبونگ میں شرف اللہ کی جوتی بھی کسی نے پار کر دی تھی لہٰذا انھوں نے اپنے والے سے بہتر کسی اور کا جوتے کا جوڑا تاک کر ہتھیا لیا۔

اِدھر اصغر کو اس کے یار دوستوں نے گھیر لیا اور سہرے پر سہرے پڑھے جانے لگے جن میں دولہا اگر آفتاب تھا تو دُلہن مہتاب، سائل صاحب بھی سہرا کہہ کر لائے تھے اور اپنے پڑھنے کی طرز اور انداز بیان پر داد پر داد لیتے تھے۔

محفل طرب و انبساط تھی۔ ہر بندہ و بشر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وقت کا بھلا کس کو دھیان رہتا۔ اور عصر کا وقت ہوتا جا رہا تھا۔ جب بہت دیر ہوگئی تو حبیب الدین نے اشفاق سے اصرار کیا کہ جلدی رخصتی کرا دو۔

اور آخر کار زنان خانے میں اصغر کو آرسی مصحف کے واسطے بلایا گیا۔

ڈیوڑھی ہی میں بہنوں نے سر پر دوپٹے ڈالے اور آنچل کی چھاؤں میں اسے لے کر چلیں، "دولہا اندر آتا ہے" کی آواز سنتے ہی محرم اور نامحرم کیا بوڑھی کیا جوان سب ہی دولہا کو دیکھنے کے اشتیاق میں گد گد کرتی دالان میں سمٹ آئیں۔ کہیں پازیب اور چوڑیوں کی چھم چھم تھی کہیں بھانجن اور چھاگل کی جھنک۔ کاسنی اور بسنتی، آتشی، سرخ اور عباسی رنگ کے طول طویل پاجاموں کے پائینچے سنبھالتی جن کی کلی کلی پر گوکھرو،

پوتھ اور سلمہ ستارے ٹکے ہوئے تھے اور جن کے بوجھ سے پہننے والیوں کی کمریں لچکی اور بل کھاتی تھیں، بادلے کے فالسئی اور اگرئی دوپٹے جو چھٹے اور بیک کے آنچل پلّو کے وزن سے چلنے میں سر اور سینوں پر سے بار بار پھسلے جا رہے تھے۔ اور خوش تنوں کے چمپئی اور صندلی گداز بدن آب رواں، جالی اور گلشن کی باریک باریک کھسی ہوئی انگیوں اور چسپی ہوئی کرتیوں کی اوٹ جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان پر گنگا جمنی لباسوں کی جگمگاہٹ اور جڑاؤ جھومر ٹیکے کی جھل مل کا عکس پڑتا جس سے تر و تازہ گالوں کی تابش اور بڑھ جاتی۔ گول گول بازوؤں پر نونگے اور جوشن دمکتے جن کو دیکھ کر ستاروں کا گمان ہوتا۔ موتیوں کی مالا، ست لڑے اور چندن ہار بلوری گردنوں کو اور آبدار بنا رہے تھے اور حسن و صباحت کے ان مرقعوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ یاں قوس و قزح کے پُرفریب رنگ اور آفتاب کی چمکتی ہوئی کرنیں ہمراہ لے کر زمین پر اتر آئی ہیں۔ سب نے مل کر دولہا کو چاروں طرف سے اس طرح نرغے میں لیا کہ سانسوں کی گرمی اور معطر جسموں کی حرارت سے دسمبر کے جاڑے میں پسینے آ گئے۔

ستاروں کا سمٹتا ہوا یہ حسین جھرمٹ قدم بہ قدم دالان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پیروں کی جنبش سے گھنگھرو بولتے اور پازیب ٹھنکتی۔ بل اور توڑے سونا اور چاندی ایک دوسرے سے ٹکرا کر شکر بھرتے۔ عطر موتیا اور عنبر کی تیز اور مست خوشبو نے ہوا کو بھاری اور فسوں ساز بنا دیا تھا اور اس کے ساتھ ڈومنیاں لہک لہک کر گا رہی تھیں اور پوری فضا شادی کے گیتوں سے گونج رہی تھی۔

میا پیارا بنڑا آیا ری
بڑی دوری سے بنڑا ابلایا ری

خراماں خراماں دولہا دالان تک پہنچا اور مسند پہ بٹھایا گیا اتنے میں ڈومنیوں نے نئی چیز گانی شروع کر دی:

نور کے تنبو تلے لا کے بٹھا یاری بنا
چل کے دیکھو ری سکھی سب سے سوا یاری بنا
سیج مخمل کی بچھی تکیے مشجر کے لگے
چل کے دیکھو ری سکھی

بیگم نہال نے بیٹے کی بلائیں لیں۔ ان کی پیشانی کے تینوں بل خوشی اور مسکراہٹ سے دب گئے تھے اور اصغر دلہن کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

اور جب بلتیس سرخ جوڑے اور دوپٹے میں دلہن بنی پھولوں کے گہنے اور سہرے سے لدی سہاگ عطر میں بسی بسائی دولہا کے مقابل لا کر بٹھائی گئی ہے تو ڈھولک کی تھاپ پر بڑے سہانے بول لہریں لے رہے تھے:

لال جوڑے والی بنو میں نے پائی
اس ری بنو کو جھومر سوہے
ہیرے موتی والی بنو میں نے پائی

اسی اثنا میں دولہا دلہن پر کارچوبی دوپٹہ ڈال دیا گیا اور آرسی مصحف کی چشمک شروع ہو گئی۔

میراسن نے آگے بڑھ کر کہا: "میں صدقے گئی میرے سرکار۔ کہیے بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام ہوں۔"

اصغر نے کہا:

"آنکھیں کھولو میں تمہارا گلاب ہوں۔"

میراسن بولی:

"نہیں میاں دلہن بیگم آنکھیں نہیں کھولیں گی، اللہ رکھے جب تک غلام نہیں کہیں گے۔ اسے سرکار کہیے غلام ہوں۔"

دوپٹہ تن جانے سے اندرا اندھیرا ہوگیا تھا اور آئینہ میں صورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ اور اصغر اس رخِ زیبا کو دوبارہ دیکھنے کے لیے بیتاب تھا جس کے تصور میں اُس نے دکھ درد اٹھائے تھے جس صورت کا وہ دیوانہ وار عاشق تھا۔ لیکن بلقیس نے شرم و حیا کے سبب اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا۔

میراسن پھر بولی۔

"اے میاں کیا کر رہے ہیں۔ دیکھو لیا منہ ؟"

"ارے دیکھوں کہاں سے۔ وہ گھونگھٹ ہی نہیں کھولتیں۔"

"اے واہ سرکار وہ کیوں کھولیں ہیں واری گئی اپنی بنو پر سے بسم اللہ کر کے خود گھونگھٹ اٹھائیے۔ قل پڑھ کر دلہن کی مانگ میں سر ورج بھر دیجئے۔"

اور اس وقت سب میراسنیں، بنے کے پانوں پر ایک ہاتھ رکھ رکھ کر اس قوت اور زور شور سے خوش ہو کر اور جوش سے لے کر گا رہی تھیں جیسے ان ہی کی شادی ہو رہی تھی اور شادی کے سارے لطف و نشاط دراصل انہی کے تھے۔

میری ہریالی گھونگھٹ کھول سدا متوالی گھونگھٹ کھول
ترے گھونگھٹ میں چندا براجے
سونے کی ڈنڈی روپے کے پلڑے
تو بیٹھی ہے جوبن تول اناں پیاری گھونگھٹ کھول

اصغر نے گھونگھٹ الٹ دیا اور دلہن کی مانگ میں صندل لگا دیا۔ بلقیس نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی لمبی لمبی گھن دار پلکیں جو نمی سے اور چمکیلی ہو گئی تھیں، دھیرے دھیرے اوپر اٹھائیں اور اپنی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں کھول دیں اور اصغر کو شرما کر دیکھا۔ نگاہوں کے تصادم کے ساتھ ایک شرارہ دونوں کے دلوں میں یک وقت چمکا اور اصغر کے مرتعش دل میں جذبات کی شورشوں نے بے قرار آرزوؤں کا طوفان

بپا کر دیا۔ بلقیس کے احساسوں نے پہلی انگڑائی لی اور اچانک جاگ اُٹھے۔ اس نے مجوب ہو کر اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں اور اصغر اس ساعت کا منتظر تھا جب بلقیس اس کی جانِ تمنا بن کر اس کی پرشوق آغوش میں ہو گی اور ہمیشہ اسی کی رہے گی حتیٰ کہ موت کے سوا کوئی ان کو جدا نہ کر سکے گا۔

تین بج چکے تھے اور وحیدہ بیگم نے شہباز بیگم سے وداع کی اجازت چاہی خوشی کے نغمے ختم ہوئے اور منڈھا گایا جانے لگا:

پربت بانس منگا مورے بابل
ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل
نیکا منڈھا چھوا اُورے بابل

شہباز بیگم دھاروں دھار رونے لگیں۔ حالانکہ وہ بلا وجہ غم کا [illegible] والوں میں نہ تھیں۔ لیکن بیٹی کی رخصتی ایک غم انگیز واقعہ ہوتی ہے۔ بہنیں، بھاوجیں بلکہ محلہ والیاں بھی اس وقت آنسوؤں دریا بہا رہی تھیں۔ عورت کی حقیقت ہی کیا؟ وہ اسی دن کو پیدا ہوتی ہے کہ ماں باپ پال پوس کر پروان چڑھائیں اور جوان ہوتے ہی پرائے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیدیں اور وہ دوسروں کی ہو جائے۔ ان غیر لوگوں کی جن کو اس نے کبھی دیکھا تھا نہ بھالا جن سے اس کو نہ محبت تھی نہ الفت۔ آج جب [illegible] کی بہاریں دیکھنے کے دن آئے اور وہ اس قابل ہوئی کہ ماں باپ کے دکھ درد میں شریک ہو، جب ان کی خوشیوں میں خوش اور ان کی زندگی میں شامل ہو کر ہاتھ بٹائے تو وہ غیروں کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اب وہ ان ہی کی کہلائے گی اور اس کے [illegible] وہ بن جائیں گے۔

ہم تو بابل ترے بیلے کی کلیاں گھر گھر مانگی جائیں رے
ہم تو بابل ترے چھاجنے کی چڑیاں شام پڑی اڑ جائیں رے

ہم تو بابل ترے کھونٹے کی گیاں جدھر باندھیں بندھ جائیں رے
کاہے کو بیاہی بدیس رے سکھی بابل مورے

اور یہ سارے جذبات تھے جو دلہن کے عزیز و اقارب پر غم و یاس کے بادل بن کر چھاگئے اور منڈھے کی پُرسوز لَے اور مغموم بول سننے والوں کے دلوں کو چھیڑ چھیڑ کر اشکریز ہے تھے۔ اور اس وقت ان کے دل گداز ہو کے رنج والم سے لبالب تھے۔ دولہا والوں میں سے بھی بہت سے پُرنم ہو گئے۔ یہاں تک کہ وحیدہ بیگم جن کو بھائی کی شادی کی سب سے زیادہ خوشی تھی، وہ بھی اس گھڑی خوشی اور رنج میں امتیاز نہ کر سکیں اور ان کے آنسو ان کی آنکھوں سے فرار ہو کر رخساروں پر بہہ کر آ گئے۔ چنبیلی در سے لگی ایک کونے میں کھڑی ٹسر ٹسر زار و قطار رو کر دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔

بھیا کو دینی محل دو محلے ہم کو دیا پردیس رے
گڑیا کھلونے میں نے طاق میں چھوڑے
چھوڑا سہیلیوں کا ساتھ رے سکھی بابل مورے

مرزا شہباز بیگ اور بندو بھی رخصت کرنے اندر آ گئے۔ ان کے چہرے آزردہ تھے اور ان آنسوؤں نے جو خشک ہو چکے تھے ان کے گال ملگجے کر دیے تھے۔ ان کی بیٹی اب رخصت ہو رہی تھی اور اس کا بندھن کسی اور سے بندھ چکا تھا۔ وہ ان کی نہیں تھی۔ اب یہ اس کے شوہر کی راضی و رضا پر منحصر تھا کہ وہ چاہے تو ملتیں کو اپنوں سے ملنے دے یا نہ ملنے دے وہ بھی احتجاج بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن خدا کی مرضی یہی تھی اور دنیا کی یہی ریت، یہی فطرت کے تقاضے اور کارِ قدرت بھی یہی۔ اسی ڈھنگ ان کے باپ دادا بھی دوسروں کی بیٹیاں لے کر آئے تھے اور وہ خود بھی اسی بات پر قائم تھے اور ان کی اولاد بھی اسی طرح پرائی لڑکیوں کو اپنا کرتی رہے گی۔
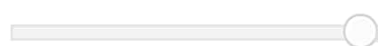
مگر حقیقت تلخ ہے اور جدائی اذیت سے خالی نہیں۔ اٹھارہ برس وہ ان کے ساتھ رہی تھی، وہ حسین و لطیف اٹھارہ سال، پیار و محبت سے لبریز زمانہ اور آج وہ ان سے وداع ہو رہی تھی باپ نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرا، کچھ نصیحتیں کیں کچھ دعائیں دیں پھر وہ باہر چلے گئے۔ منڈھے کے بول زیادہ پُر درد تھے؛

امبوا تلے سے نکلا جو ڈولا
کوئل سبد سناؤ رے
تو کیا روئے میری کالی کوئلیا
چھوڑا ہم نے بابل کا دیس رے

وقت گزر رہا تھا اور اصغر دلہن کو لے جانے کا منتظر کھڑا تھا، وداع کی گھڑی نے اس کو بھی اداس کر دیا تھا۔ اس کے ارد گرد سب عورتیں اشکبار تھیں اور ملقیس بھی گھونگھٹ میں سسکیاں بھر رہی تھی۔

اصغر نے جیسے ہی جھک کر اس کو گود میں اٹھایا تو اس کے قرب اور لمس سے دل ایکا ایکی اُچھلا اور پُر لذّت خواہشیں مچلنے لگیں، لیکن یہ مسرت کیسی تھی جس میں کہیں غم بھی جھلک رہا تھا۔ کبھی کبھی رنج اور خوشی کے فاصلے مٹ جاتے ہیں اور ان کی حدود اس طرح ختم ہو جاتی ہیں کہ ان میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔

جب اصغر اپنے معطر اور عزیز بوجھ کو لے کر نیلے نیلے آسمان کے نیچے آیا تو ایک سفید بادل کا ٹکڑا امنگ کی طرح پھیل گیا، فطرت اور فضا بھی اصغر کی خوشیوں میں شامل ہو کر عشق و محبت کی خوش طالعی پر مسرور نظر آنے لگیں۔ منڈھا ابھی تک گایا جا رہا تھا:

سونا بھی دینا روپا بھی دینا
ایک نہ دینی سسر کی کنگھی

03:07 79%

rekhta.org/ebooks/

دلّی کی شام

ساس نند بولیں بول رے
کا ہے بیاہی بدیس

اصغر کے کانوں میں منڈھے کی بازگشت گونج رہی تھی۔ تاشے باجے بجتے رہے۔ مست تانیں ہوا میں ابھرتی رہیں۔ ہنسی مذاق ٹھٹھے ٹھٹھول کے ساتھ برات گلی کوچوں میں سے ہوتی ہوئی میر نہال کے گھر پر آ پہنچی۔

دلچین نے دلہن کے پاؤں دودھ سے دھلائے۔ بیگم نہال نے بہو کو چاندی کے جنکی چھلّے پہنائے اور اصغر نے گود میں اٹھا کر دہلیز پار کرائی۔ بہنوں نے بارڑ روکی نیگ وصول کر لیا تب کہیں اندر لے جا کر دلہن کو مسند پر آرام سے بٹھایا۔

کھیر چٹائی اور دولہا کو ڈھکانے کی رسم کے بعد سب کی خواہش پر وحیدہ بیگم بہت فخر سے دلہن کا منہ اٹھا اٹھا کر رونمائی کرنے لگیں۔ بلقیس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ شرم سے گردن جھکائے بالکل دوہری ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے خوبصورت سیاہ بال موتیوں کے جھومر میں سے جھلک رہے تھے۔ ماتھے پر افشاں چنی ہوئی تھی۔ لال چُنّی بڑی ہوئی ممتنہ اور ہونٹوں پر جمی ہوئی مستی کی باریک تہ نے اس کے حُسن اور ملاحت کو دوبالا کر دیا تھا۔ رشک سے لوگ بار بار دیکھتے آنکھیں حُسن کو دادِ حُسن دیتی ہوئی پھسل جاتیں اور پھر اسی موہنی صورت پر آ کر ٹھہر جاتیں۔

اصغر کو شمس اور سعید حسن نے گھیر کے بٹھا لیا اور اس کو صنفِ لطیف کے متعلق ساری معلومات بہم پہنچانے لگے۔ جنس کے اسرار اس کی لذّتیں بڑے چسکے لیکر بتاتے۔ اصغر جھینپا ہوا ہنس ہنس کر سب کی باتیں سنتا رہا۔

جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو ہر ایک تھکن سے بے حال ہو کر غافل سو رہا..... آسمان پر لاکھوں ستارے چمک رہے تھے۔ آج ان کی جگمگاہٹ میں شوخی بھی تھی اور بے تابی بھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جذبات کو اکسا رہی تھی اور اصغر

257
427

Scanned by CamScanner

شوق سے مجبور اور وارفتہ ہو کر دبے پاؤں شبِ عروسی کے کمرے میں چلا گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اگلے روز دلہن کے میکے جانے کے بعد شادی کے ہنگامے اسی طرح برقرار رہے۔ حبیب الدین نے شمس کو بازار بھیجکر رنگ گلال اور عبیر منگوا کے دیگوں میں رنگ گھلوا دیا۔ پھر کیا تھا پچکاریاں بھر بھر کے ایک دوسرے پر رنگ پھینکنے لگے جو چھپنے یا رنگ سے بچنے کی کوشش کرتا اس کی شامت زیادہ آتی۔ حبیب الدین، سعید حسن کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے لیکن سعید حسن اس وقت خواجہ اشرف علی کے مکان میں جو مہمان ٹھیرانے کو مانگ لیا تھا بیٹھے نظرالحسن کو شادی کرنے کی ترغیب دلا رہے تھے۔ نظرالحسن اصغر سے دو چار سال بڑے تھے اور ملازمت بھی معقول اور پکی تھی۔ مگر تھے ابھی تک کنوارے۔ چنانچہ سعید حسن کہہ رہے تھے:

"میاں جاڑے کی چاندنی اور غریب کی جوانی کس نے دیکھی ہے؟ یہ عمر اور یہ جوانی یوں نہ گنواؤ۔ مہینہ بھی سہالک کا ہے۔ شوشو کرتے جو جاڑے میں سکڑتے پھرتے ہو تو بھیا سردی جائے روئی سے یا دُوئی سے۔"

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ نظرالحسن پند و نصائح کا خاک بھی اثر نہیں قبول کر رہے بلکہ چکنا گھڑا بنے بیٹھے ہیں تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر انھیں قصّہ سنا کر قائل کرنے لگے:

"کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک لکڑہارا رہا کرتا تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی ایک روز دونوں باپ بیٹی قریب کے جنگل میں لکڑیاں چننے گئے۔ وہاں پہاڑی کے دامن میں ایک غار تھا جس میں لال لال پتھر پڑے ہوئے تھے۔ لڑکی نے ان کو دیکھا تو ایک دم چیخی:

"ابا ابا، لعل" یہ لکڑہارا بولا "پگلی ہوئی ہے یہ لال رنگ کے پتھر ہیں، لعل

دلّی کی شام

کہاں ؟

"اب اسی گاؤں میں ایک بنیا بھی تھا۔ ایک روز اتفاق سے اُس کا گزر بھی اس جنگل میں ہوا اور اُس نے پہاڑی کے دامن میں پڑے ہوئے لال لال پتھر دیکھے، وہ دو پتھر اٹھا لایا اور تسلی میں باندھ کر شگون کے لیے اپنی دوکان میں لٹکا دیے۔ ایک دن جو لکڑہارا اور اس کی بیٹی بنیے کی دوکان پر نون تیل لینے آئے جیسے ہی لڑکی کی نگاہ ان پتھروں پر پڑی وہ پھر چیخی "ابا ابا لعل" اب جو بنیے نے پتھروں کو غور سے دیکھا تو واقعی وہ سچ مچ لعل ہی تھے۔ بنیے نے لڑکی سے پوچھا "اری تو نے ایسے پتھر اور کہیں دیکھے ہیں؟"

وہ بولی؛

"ہاں ہاں۔ پہاڑی کے غار میں"

یہ سنتے ہی بنیے نے لکڑہارے سے کہا؛

"اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دے"

معلوم ہے کیوں؟ بنیا گدھا تو نہ تھا۔ عورت لکشمی ہوتی ہے اور اُس نے سوچا یہ لڑکی جہاں جاتی ہے اسے لعل ہی لعل نظر آتے ہیں۔ تو دوست مقدر عورت کا ہوتا ہے سب دلدر دور ہو جاتے ہیں۔"

وہ ابھی بات پوری بھی کرنے نہ پائے تھے کہ حبیب الدین ان کو ڈھونڈتے ہوئے آپہنچے اور پیچھے سے پوری رنگ کی بھری بالٹی الٹ دی۔ سعید حسن برافروختہ ہو کر مڑے لیکن جب دیکھا کہ مذاق حبیب الدین نے کیا ہے تو ہنس کر بدلہ لینے ان کے پیچھے لپکے۔ اتنے میں رنگ کھیلنے والوں کی ساری ٹولی آگئی اور ایک دوسرے کو چوڑا کر دیا۔ کسی کو جو سوجھی تو اس نے صحن کے حوض میں بھی رنگ گھول دیا اور چھپا چھپ ایک ایک کو غوطے دینے لگے۔ دو چار اصغر کو پکڑ دھکڑ کے اٹھا لائے اور پورے قد سے حوض میں پھینک دیا۔ وہ چُن چُن کے سب کو ڈبکیاں دے رہے تھے۔

لیکن شرف اللہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ ایک دو اُن کی تلاش میں نکلے۔ آخر شمس نے اُن کو ڈھونڈ نکالا۔ بیچارے کئی دن کی تھکن اور جگائی کے بعد چھتے میں پڑے خرّاٹے لے رہے تھے۔ بجائے جگانے کے سب نے ان کو مع چارپائی کے کندھوں پر اُٹھا لیا اور خواجہ اشرف علی کے مکان تک لے آئے۔ وہ اللہ کا بندہ ایسے گھوڑے بیچ کر سویا تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی کیا شرارت ہو رہی ہے۔ جب وہ خواجہ اشرف کے صحن میں پہنچ گئے تو شرف اللہ کی آنکھ کھلی اور وہ دہائی دینے لگے:

"خدا کے لیے چھوڑ دو میں گر جاؤں گا۔ میں مرا۔"

لیکن کون سنتا تھا۔ اور شرف اللہ کو چارپائی سمیت حوض میں غڑاپ سے اُلٹ دیا۔ غریب نے یخ پانی میں دو چار ڈبکیاں کھائیں۔ آنکھ ناک میں پانی گھس گیا اور وہ کلیاں کرتے چھینکتے کھڑے ہو گئے اور سب نے خوب قہقہے لگائے۔

پھر تو شرف اللہ بھی بدلہ لینے پر ایسے اترے کہ میر نہال کو بھی نہیں بخشا۔ اور کسی کی تو اتنی مجال نہ تھی کہ ان سے گستاخی کرتا اور رنگ کھیلتا۔ میر نہال شرف اللہ کی شرارت اور بیباکی پر مسکرا کر چپ ہو گئے اور اپنے پر سے گلال جھاڑنے لگے۔ جوش میں سب نے رنگ کی بالٹیاں اٹھا اٹھا کر مرزا شہباز بیگ کے گھر کا رُخ کیا اور مرزا جی کو رنگ کر ہولی کا بھڑوا بنا دیا۔ وہ شرف اللہ پر بہت بھنّائے لیکن کسی نے پوری بالٹی اُن پر انڈیل دی۔ اس پر اشفاق لڑنے مرنے کو کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیا لغویت ہے۔ ختم کیجیے۔ اس مذاق کو۔ اس سردی میں کیا کسی کی جان لینی چاہتے ہیں؟"

"بس آپ یہی سمجھتے ہیں۔ ذرا دیکھیے تو۔" یہ کہہ کر شرف اللہ نے اپنی فوج کو للکارا:

"دیکھتے کیا ہو بچ کے نہ نکل جائیں بڑا غرّہ ہے انہیں!"

اور پھر تو سب نے مل کر اشفاق پر نہ صرف رنگ ڈالا بلکہ جس کے ہاتھ جو لگا، گلی کی موری کی کیچڑ، مٹی، غلاظت سب ان کے منہ پر لیپ دیا۔ بندو کی حالت بھی قابل رحم تھی وہ سوانگ کا بیجا بنا کھڑا سردی سے پھریریاں لے رہا تھا۔ گھر میں ادھر عورتیں بھی خوب تفریح کر رہی تھیں۔ اناؤں کی دیکھا دیکھی بچے بھی بے آپے ہو گئے تھے۔ کلیم بیگم اور جمال بیگم نے بوڑھیوں ٹھوڑیوں کو دیگوں کے کنارے زبردستی لا لا کر تر بتر کر دیا۔ دیواریں رنگین ہو گئیں۔ صحن میں ہر طرف نیلا پیلا رنگ بکھرا ہوا تھا۔ سفید بگلا سے سر گلال سے گلنار ہو گئے اور بیویوں کے کپڑے جوڑا ہو کر جسموں سے چپک گئے اور جسم کی گولائیاں اور خط واضح ہو گئے۔ چہرے رنگ برنگے ہو کر دیوالی کی گڑیاں نظر آرہے تھے۔

غفور اور احمد و زبیر آپس میں رنگ کھیلتے کھیلتے ایسی ترنگ میں آئے تھے کہ محلے والوں کو بھی نہ چھوڑا۔

اور جب سب تھک کے چور ہو گئے تو مل مل کر نہلائے، اور کپڑے بدل بدلا کر انسانوں کی جون میں آئے۔

شادی کا ہنگامہ عبیر اور گلال اڑا کر اور جوتی کھیل کر کیف و خوشی سے بخیر و خوبی رخصت ہوا اور مہمان ولیمے کے بعد ایک ایک کر کے اپنے ٹھکانوں کے ہو گئے اور ان کے جانے سے گھر سُونا سُونا معلوم ہونے لگا۔

۳

بیاہ کے بعد اصغر بہت ہی خوش رہنے لگا بلقیس کو پا کر اسے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں جہاں کی نعمت مل گئی ہے۔ بلقیس نئی نویلی دلہن زیور میں گوندنی کی طرح لدی عطر سے مہکی ہوئی شرمائی لجائی ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکالے تمام دن بیٹھی رہا کرتی۔ چلتی تو قدم بھی گن گن کر اٹھاتی، نئی نئی زندگی، نیا نیا گھر، نئے لوگ، نئی چال نیا ڈھب اور دلہناپے کا زمانہ۔ کوئی ضرورت ہوئی تو چنبیلی ساتھ ہی آتی تھی اس کے کان میں چپکے سے کہہ دیا۔ بیگم نہال اپنی سکڑی سمٹی شرمیلی بہو سے اکثر کہتیں:

"بیٹی تمہارا ہی گھر ہے۔ چلو پھرو، جو جی چاہے کرو۔ تمہیں کون روکتا ہے۔"

البتہ جب وہ اپنے میکے میں ہوتی آزادی سے بات چیت کرتی اور اٹھتی بیٹھتی سسرال میں صرف رات کے وقت جب وہ اپنے کمرے میں جاتی تو شرم ایک حد تک کم ہو جاتی پھر وہ اور اصغر بے تکلفی سے باتیں کرتے۔

لیکن اکثر جب وہ دونوں یکجا ہوتے تو اصغر اس کی کمر کے گرد ہاتھ حمائل کر دیتا۔ اس کی گرفت میں دباؤ اور قید کا احساس ہوتا اور بلقیس بولتے بولتے

خاموش ہوجاتی۔ اصغر اس کو اچانک خاموش دیکھ کر پوچھتا تم چپ کیوں ہو اور بلقیس اس سے بغیر نگاہیں ملائے ہوئے کہتی آپ بتایئے کیا باتیں کروں۔ ایسی روح پرور تنہائیوں میں اصغر کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی کہ بلقیس کی آواز کسی بہتے ہوئے جھرنے کی طرح نغمہ بار ہو، اور زبانِ حُسن داستانِ عشق کہے جس میں وصال کے فسانے اور ہجر کی بے قراریاں ہوں، اور بلقیس بڑھ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دے، اس کو پیار کرے، تم میری جان ہو کہہ کر اپنی الفت و چاہت کا یقین دلائے۔ لیکن بلقیس ایک سیدھی سادی سی مشرقی لڑکی تھی، جہاں دبی دبائی حیا اُبھر کر زیادہ سے زیادہ میرے سرتاج تو کہہ دیتی مگر اس سے سوا اس کو عشق اور اظہار عشق کے وہ تمام رنگین اور لذّت بھرے طریقے نہ آتے تھے جن کا اصغر اس سے طالب تھا۔

اصغر جب کبھی اس سے کہتا؛

"تمہاری حسین آنکھوں میں عشق کی پُر کیف آرزو اور شوق پنہاں تھے اور تمہیں اپنی آغوش میں لینے کو میں مجنوں سے زیادہ بے قرار تھا" تو اس کے صندلی گالوں پر حیا کی سُرخی بکھر جاتی اور وہ بدن چرا کر بڑی بڑی آنکھیں جھکا لیتی اور اصغر جواب نہ پا کر بڑی اُمید سے پوچھتا؛

"بلقیس میری طرف دیکھو۔ کیا تمہیں مجھ سے عشق نہیں؟ بولو بلقیس"

اور بلقیس والہانہ ادا سے صرف مسکرا کر رہ جاتی، یا اصغر کے تقاضوں پر کہتی:

"جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ دیکھا تو سچ مچ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گھر کے کس کونے میں چھپ جاؤں" اس جواب سے اصغر کے بھڑکتے ہوئے جذبات پر اوس پڑ جاتی۔

تخیّلات کی دنیا میں بسنے والے اصغر نے بلقیس کو بھی اپنے ہی جیسا بنا

عاشق تصور کر لیا تھا، اور اپنے تصور میں نہ جانے کیوں اس کو یہ یقین تھا کہ وہ بھی اس کی محبت اور فراق میں تڑپ تڑپ کر گھلتی رہی ہوگی۔ وہ اپنے خیالوں میں خود کبھی ایک بہادر راجپوت بن جاتا تو کبھی وہ مغل شہزادہ جس نے کسی عشق کی ماری دوشیزہ کو اپنا دست محبت تھما کر اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے قلب میں عشق کے وہ آتش کدے دہک رہے تھے جو ملکہ نور جہاں کی محبت میں جہانگیر کے دل میں بھی نہ سلگے ہوں گے چنانچہ بلقیس ممتاز محل سے بھی بڑھ کر حسین اور پیاری بن جاتی۔

مگر بلقیس قفس کی وہ بند چڑیا تھی جس کو آداب قید و بند اچھی طرح آتے تھے۔ وہ پرواز چاہے بھول چکی ہو مگر جذبۂ آزادی جوں کا توں دل میں باقی تھا۔ عشق کے درس دیے نہیں جاتے، اس کے راز و اسرار خود بہ خود کھل جاتے ہیں، اور عشق اپنے اسلوب خود سکھا دیتا ہے۔ چاہے بلقیس میں وہ گدگدانے والی ہیجانی کیفیت نہ رہی ہو لیکن اس نے اصغر کی خواہشات کو کبھی نہ ٹھکرایا تھا۔ اگر خوبصورت اور بناوٹی الفاظ اعلانیہ اعلانِ محبت نہ کر سکتے تھے تو اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ اصغر کو چاہتی نہ تھی۔ بلقیس کا اچھوتا دل محبت کی پوری گرمی اور چاشنی سے آشنا تھا۔ اصغر اس کے واسطے نہ صرف ایک شوہر تھا بلکہ اس کے لیے بلقیس کی روح اور ہستی تک حاضر تھی۔ اس کی نگاہوں میں اصغر ایک دیوتا تھا جس کے چرنوں پہ پہلے دن ہی وہ تن من دھن وار چکی تھی اور اسی عشق کے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ اکثر نظریں چرا کر اصغر کو محبت میں سرشار نگاہ سے دیکھتی۔ ایسے لمحات میں وہ وارفتہ ہو جاتا اور اسے محسوس ہوتا کہ اسے عشق کی معراج حاصل ہو گئی ہے اور اس کے دل میں از سر نو محبت کے چراغ روشن ہو جاتے اور ان کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کو ایک عجیب لذت و سرور ملتا۔ وہ بلقیس کو بیتاب ہو ہو کر بھینچتا اور پیار کرتا۔ اصغر کے اس اضطرار و ہیجان کے باوجود بلقیس اپنی سادہ محبت میں رنگ آمیزی

نہ کر سکتی بلکہ جوشِ محبت اس کے لبوں پر اور مہرِ سکوت ثبت کر دیتا۔ اس وقت اصغر کو مشتری بائی اور اپنی ساری دیرینہ آشنائیں ایک ایک کر کے یاد آتیں ان کی وہ ارمان نواز باتیں اور بوس و کنار یاد آتے جن کے چٹخارے وہ اپنی بیوی کی ذات میں تلاش کرتا۔ ان عورتوں کے طرب کوش غمزہ و عشووں کے مقابلہ میں ملقیس اس کو پھیکی اور خشک معلوم ہوتی۔ لیکن وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کے نقش و نگار دلآویز تھے۔ گدرایا ہوا سڈول جسم اور بھرپور جوانی تھی اور اصغر کے خیال جلد ہی پلٹا کھا کر اس کے جوان اور خوبصورت جسم کے گرد منڈلانے لگتے اور وہ ملقیس کے حُسن کے سہارے خوابوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا اور بیوی کی اس سادگی کو جس میں شدتِ جذبات کی کمی تھی اس کی طرز اور گھر کے چلن پر محمول کر کے صبر کر لیتا۔ اور وہ ان خود فریبیوں میں ملقیس کو اسی شدت سے چاہتا چلا گیا لیکن دراصل اس کو ملقیس سے تو اتنی محبت نہ تھی جتنا وہ اپنی ذات کا عاشق تھا۔ اس کو اپنے ان خوابوں سے محبت تھی، اپنے اس تخئیل و تصور سے جو ملقیس کے حسن سے وابستہ ہو کر اس کے واسطے کائنات بن گئے تھے۔

ملقیس کی والدہ کو چونکہ اپنی ذات سے دلچسپی تھی اس لیے وہ دنیا اور اس کے بکھیڑوں میں پورے انہماک سے لگی رہتی تھیں لیکن ملقیس اس معاملے میں ان کے برعکس تھی، اور اس کی فطرت بالکل جدا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ملقیس کو اس کی پھوپی نے جو لاولد تھیں گود لے لیا تھا اور ان کے انتقال کے وقت تک وہ انہی کے پاس چودہ برس رہی تھی۔ اس لیے اس کی تعلیم و تربیت شریف گھرانوں کی عام فضا میں ہوئی تھی، جہاں لڑکیوں پر کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے، اشاروں کنایوں سے دنیا کی ساری اونچ نیچ آنکھ کھلتے ہی ذہن نشین کرا دی جاتی ہے۔ ان کے جذبات اور امنگوں کی کونپلیں وجہ اونچی نہیں ہوتی۔ زمانے دستور کا جو چلن تھا اس کے

مطابق انھوں نے بلقیس کی دیکھ بھال بخوبی کی تھی۔ اُردو لکھنی پڑھنی اتنی سکھا دی تھی کہ مذہبی کتب اور رسائل کے علاوہ بوقتِ ضرورت خط لکھ پڑھ لے اور امورِ خانہ داری سے متعلق جتنے چٹکلے اور گُر ہوتے ہیں وہ گڑیوں کے کھیل میں ہوش سنبھالتے ہی آگئے، اور بلقیس سینے پرونے میں طاق اور کھانا پکانے میں مشاق تھی۔ ایک اچھی بیوی اور سگھڑ بہو بیٹی کے لیے یہی ضروری فرائض تھے کہ وہ جہاں جائے اپنی گھرداری خوش اسلوبی سے چلا سکے۔ بلقیس کا لڑکپن تو گڑیاں کھیلتے گزر گیا مگر شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی اس پر وہی پابندیاں عائد ہوگئیں جو سب مشرقی لڑکیوں پر اس رسم و رواج میں جائز تھیں۔ اور اس کے کان میں بھی یہی باتیں پڑتی رہیں۔" اے بیٹی اب اللہ رکھے سیانی ہوگئیں، ڈھنگ پکڑو۔ تمہیں پرائے گھر جانا ہے۔ بہتیرے غیروں سے پالا پڑے گا۔ کہتے ہیں ماں جنم کی ساتھی ہوتی ہے کرم کی نہیں۔ کون کیسا ملے گا۔ ابھی سے آرام اور بڑھیا بڑھیا کپڑوں کی عادت پڑ گئی تو مشکل ہوگی" بناؤ سنگھار صرف جنم مرن کے ساتھی کے لیے مخصوص تھا اور کوئی لڑکی نہ بیاہ سے پہلے عطر لگا سکتی تھی نہ پھول گل پہن سکتی تھی اور نہ پان کھا کر ہونٹ رچا سکتی تھی۔ اے خدا کی سنو! پھول سا پنڈا ہے۔ ابھی سے ہار پھول پہنو گی منہ کا نور اُڑ جائے گا۔ بچیاں بھولی بھالی اچھی لگتی ہیں۔ پھر کون ایسی بیوقوف تھی جو منہ کا روپ انوپ اڑانا چاہتی ہو۔ لہٰذا گدرائے جسم اور البیلی جوانیاں گاڑھے گزی اور کوری ململ کے دوپٹوں میں ملفوف پرائے گھر جانے اور کسی ان دیکھے مرد کے خوابناک تصور میں مطمئن اور مسرور گزر جاتیں۔ پھر وہ وقت بھی آجاتا اور یہ تمام شوق اور حرص و ہوس جنت و دوزخ کی فرحت و اذیت کے مختصر فلسفے میں ختم ہو جاتی" اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں اچھے بُرے مقدر سے دوچار ہونے اور مخالف حالات کا خوگر بنانے کے لیے وقت سے پہلے تیار کر دیا جاتا۔ نشیب و فرازِ راہ اور خطراتِ سفر کے پہلے ہی سے سبق

ملتے اور نہ موجیں ساحل کی طرف بڑھتیں نہ طوفان آتے اور نہ فتنے ہی اٹھتے۔ بھلا اس فضا میں حضرتِ عشق کہاں براجتے اور دھونی رماتے اور ان کی کارگزاریاں گل کترتیں تو کہاں؟ اوّل تو ایسے امکانات پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر ایسی کوئی نادان لڑکی ہوئی اور بھول سے کسی خلیرے یا چچیرے بھائی سے محبت کر بیٹھی تو وہ مرتے دم تک کرنیوالی کے دل میں ہی رہتی مجال ہے جو زبان پر کسی نے حرفِ شوق یا نامِ حبیب سنا ہو۔ بدنامی اور رسوائی اور کلنک کے ٹیکے کا خوف ہوّے سے بھی زیادہ تھا کیونکہ ہزاروں سال سے دادی سے پوتی اور ماں سے بیٹی کو یہ اصولِ زندگی اور عزّت کے درس سینہ بہ سینہ ملتے چلے آئے تھے۔ یہ سب ایک ہی چمن کی پروردہ تھیں جہاں 'جان جائے پر آن نہ جائے' کا زرّیں نقش تحریر تھا۔

بلقیس کو یہی سب سکھایا گیا تھا اور وہ اتنا ہی جانتی تھی۔ اگرچہ اس کی محبت دریائے لنگر دار تھی لیکن مُنہ سے بھاپ کبھی نہ نکلنی تھی۔ رہے محبت جتانے کے گورکھ دھندے تو وہ اس کی حدودِ گویائی سے بھی دور تھے اور اصغر انہی دکھاوں کے لیے نیم جاں ہو رہا تھا۔ حالاں کہ بلقیس اس کی آغوش میں سما کر اپنی ہستی کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔

بلقیس کو ساس سُسر کے گھر میں کوئی خاص تکلیف نہ تھی، لیکن سسرال پھر سسرال ہے اور نئی نئی بہوؤں کو لحاظ اور ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ گو بیگم نہال سے لے کر ہر چھوٹا بڑا اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا لیکن حجاب آخر اٹھتے ہی اُٹھتے اٹھتا ہے جمال بیگم سے چونکہ میکہ کی کنبہ داری تھی، بلقیس ان ہی سے بے تکلف ہو گئی اور اکثر ان کے پاس کوٹھے پر جا کر بیٹھ جاتی۔ مگر دل اکثر چاہتا تھا کہ اس کا اپنا الگ ایک گھر ہو جہاں وہ پوری آزادی سے رہ سکے، اور بلا پس و پیش جس طرح چاہے اپنے اصغر کی نازبرداریاں اٹھائے۔ لیکن اصغر سے اس نے اپنی خواہش کا ذکر نہ کیا۔ وہ ابھی

میاں کی طبیعت سے پوری طرح واقف نہ ہوئی تھی نہ معلوم وہ اس سادی سی بات کو کس پیرائے میں لے۔

جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا بیگم نہال اپنی بہو کا دم بھرنے لگیں۔ شادی کے کوئی دو مہینے بعد ایک دن جمال بیگم نے دیورانی سے کہا، "اوئی بوا بہو کو گھونگھٹ میں کب تک گھونٹے رکھوگی؟ بس بی میں تو کہتی ہوں خیر سے گھونگھٹ بڑھا دو۔ اور جمعہ کو ساس نے بلقیس سے کھیر پکوا کر گھونگھٹ بڑھانے کی رسم بھی پوری کر دی۔ اب وہ دوسرے گھر والوں کی طرح گھر کے کام کاج میں حصہ بٹانے لگی۔

وحیدہ بیگم مہرو کی شادی کی وجہ سے ٹھہر گئی تھیں۔ ابھی بہت کچھ سلنا سلانا ادھورا پڑا تھا اور بلقیس نے خوشی خوشی سلائی ٹکائی پوری کر دی۔ کبھی کبھی اگر دل چاہا تو باورچی خانے میں جا کر اپنے ہاتھ سے کوئی خاص چیز پکا دی۔

گو وہ اب گھر کا فرد بن گئی تھی، لیکن میر نہال نے اب تک بہو سے بات نہ کی تھی اور بلقیس کو یہ بات اکثر کھٹکتی تھی۔ وہ سوچتی کہ چونکہ یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے اسی واسطے وہ مجھ سے ناراض ہیں لہٰذا ایک دن اس نے دلچین سے پوچھ ہی لیا:

"معلوم ہوتا ہے کہ ابا میاں مجھ سے خفا ہیں۔ آج تک انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔"

دلچین اس بات پر ہنس دی اور بلقیس کو اطمینان دلایا:

"نہیں بیٹی وہ کسی سے بھی خفا نہیں ہوتے، اور بھلا تم سے کیوں ہوں گے؟ خدا سلامت رکھے سرکار بڑے محبت والے ہیں۔ تم خود دیکھ لوگی۔"

شام کو میر نہال نے کھانا کھاتے کھاتے سر اٹھا کر بیوی سے پوچھا:

"یہ کوفتے کیا تم نے پکائے ہیں؟"

بیگم نہال کہنے لگیں :

"کیوں، کیا بدمزہ ہیں؟"

"نہیں بہت عمدہ ہیں۔ بڑے دنوں بعد اس مزے کے کھائے ہیں۔"

بیگم نہال خوش ہوکر بولیں :

"اللہ مبارک کرے۔ چلو تم کو کسی کے ہاتھ کا پکا بھایا تو سہی۔ اللہ رکھے اصغر کی دلہن نے پکائے ہیں۔ اب تو وہی کرتی ہے سب کچھ۔ مجھے تو خبر بھی نہیں ہوتی...."

اس کے بعد ایک دن وہ باہر سے آئے تو ان کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ وہ سیدھے بلقیس کی طرف بڑھے اور بہت محبت آمیز لہجے میں بولے :

"لو دلہن یہ میں تمہارے واسطے لایا ہوں۔"

بلقیس نے جلدی سے کاغذ کھول کر دیکھا بہت ہی خوش رنگ ہری پوتھ کا تھان تھا۔ کپڑے کو انگلیاں پھیر کر محسوس کرتے ہوئے بلقیس ایک غیر معمولی خوشی سے بولی :

"ابا میاں بڑا نفیس کپڑا ہے، اور مجھے یہ رنگ بھی بہت مرغوب ہے۔" اور میر نہال کو آداب کرکے وہ پائنچے سنبھالتی ہوئی کوٹھے پر اصغر کو سسرے کا دیا ہوا پہلا تحفہ دکھانے چلی گئی۔ میر نہال مسکرا کر بیوی سے کہنے لگے :

"اصغر کی دلہن واقعی اچھی لڑکی ہے اور میرا خیال ہے اصغر کو خوش رکھے گی لیکن اس کی ماں تو اللہ کی پناہ علامۂ دہر ہیں۔"

بیگم نہال جلدی سے میاں کی بات کاٹ کر بولیں :

"ہے ہے تم کو کیا ہو گیا ہے۔ بڈھے ہو گئے مگر تمہاری زبان کو لگام نہیں۔ بلاوجہ ایک ایک کی عیب جوئی کرکے اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرتے ہو۔ اور دلہن سن لے تو تمہاری کیسی کرکری ہو۔"

"ارے بھئی منہ پر مہر لگا دو۔ سچی بات بن کہے رہا نہیں جاتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھک میں چلے گئے۔

* * * * * *

مارچ کا مہینہ تھا اور موسم بہار کی ایک خوبصورت شام۔ اصغر اور بلقیس اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور مہندی کے پھولوں کی تیز مہک ہر جھونکے کے ساتھ اندر آتی۔ شام کی پُرکیف تنہائی اور پھولوں کی مست خوشبو سے دلوں میں نامعلوم ارمان مچلتے، محبت اور شوق کے سوز اور انبساط سے دل میں ایک میٹھا میٹھا درد کروٹ لیتا۔ دن بھر کی عشق و عاشقی کے بعد آفتاب کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا اور پہاڑیوں کے پرے جاتے جاتے اس کی آخری شعائیں ہر بادل کے ٹکڑے کو محبت سے چھو رہی تھیں، اور سارے آسمان پر دمکتا ہوا جوگیا رنگ پھیل گیا تھا جس میں بادل نارنجی ہو کر ایسے دل کش نظر آتے تھے گویا انسان کی نگاہ نے ایسے حسین و جمیل اور دلفریب رنگ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ بلقیس خیالوں میں غرق ڈوبتے ہوئے آفتاب کا منظر دیکھ رہی تھی دونوں وقت گلے مل رہے تھے اور ہلکے ہلکے رنگین اجالے میں فضا اداس تھی اور دل میں ایک موہوم یاس۔ اصغر اٹھا اور بلقیس کے قریب آکر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کے محبت اور حفاظت سے اس کو محصور کر لیا پھر بڑی نرمی سے کہا "تم اس قدر افسردہ کیوں ہو؟"

بلقیس نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اٹھا کر اصغر کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پرستش اور عقیدت عیاں تھی۔ وہ کہنے لگی:

"میں دیکھ رہی ہوں آپ ہر وقت کچھ پریشان سے رہتے ہیں۔ کیا آپ کو اب تک ملازمت نہیں ملی اس لیے؟ آخر ایسے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ خدا پر

بھروسہ رکھیے وہ بڑا کارساز ہے۔ کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔"

بلقیس نے یہ ساری بات اتنی محبت اور دلی خلوص سے کہی کہ اصغر اس کی محبت میں بیقرار ہو گیا۔ ایسی ساعتوں میں اس کا دل ہمیشہ عجیب دل آویز خیالوں اور رنگ و بو کی آماجگاہ بن جاتا تھا۔ اس کو بلقیس پر بے اختیار پیار آ گیا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر پیار وں پر پیار کرنے لگا۔ بلقیس ذرا کسمسائی اور پھر بڑے سکون سے اس کے سینہ سے اپنا سر ٹیکا دیا۔

دھیرے دھیرے سانولی سلونی شام جا رہی تھی۔ پھاگن کی البیلی رُت اور اس کی غم انگیز فضاؤں کے سوز و ساز بھی جیسے ان کے خوابِ محبت میں سمو گئے اور وہ دونوں خاموش پہلو بہ پہلو، رخسار بہ رخسار ہاتھوں میں ہاتھ لیے دور دراز فرحت انگیز باتوں کا سوچتے ہوئے اپنے خوابوں کی حسین دنیا میں کھوئے رہے یہاں تک کہ رات نے بڑھ کر ہر چیز کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ایک ایک کر کے تمام ستاروں کی شمعیں روشن ہو گئیں اور معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار پٹ بیجنے جھم جھم کر رہے ہیں اور اصغر اس خیال سے مخمور تھا کہ وہ گھر جہاں صرف بلقیس تنہا اس کے ساتھ ہو جنتِ ارضی سے کم نہ ہوگا۔

۴

بلقیس امید سے تھی اور اکثر اس کی طبیعت خراب رہتی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ دن بھر وہ امچور کی پھانک اور املی کے کٹارے چوستی رہتی، یا چھپرکھٹ میں منہ لپیٹے پڑی رہا کرتی۔ اس کا رنگ ماند پڑ گیا اور آنکھوں کے گرد حلقے دکھائی دینے لگے۔ اکثر وہ لیٹے لیٹے کھجور کے درخت کو دیکھتی جس کے نیچے کے تمام پتے زرد پڑ کر گر چکے تھے اور پھننگ پر دو چار پتے رہ گئے تھے۔ اس خزاں آلود کھجور کو دیکھ کر بلقیس کو زیادہ مایوسی ہوتی۔

لیکن پھر فوراً ہی اسے اس نئی ہستی کا احساس ہوتا جو اس کے جسم میں جنم لے چکی تھی۔ بچہ پیٹ میں پھرتا تو اس کی ہر حرکت سے دل کے پیمانے انوکھی مسرت سے چھلک اٹھتے، اور کائنات کی ہر شے دلفریب نظر آتی۔ جدھر وہ دیکھتی نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا۔ مہندی نے اپنا پرانا لباس اتار پھینکا تھا اور اس پر ننھی ننھی سبز کونپلیں آ رہی تھیں۔ چڑیاں چونچوں میں پر اور تنکے لے کر انڈے دینے کی تیاری میں نئے آشیانے بنا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اٹھلاتے ہوئے

جب بلقیس کو چھیڑتے ہوئے گزرتے تو اسے یہی محسوس ہوتا کہ نوید حسن اور وجودِ نو کے سندیسے لے کر آئے ہیں۔ ان کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ میں زندگی کی خوشی کے مدھ بھرے گیت سنائی دیتے۔ وہ احساسِ فرحت سے مطمئن ہو جاتی اور مسکرا کر اپنے دوپٹے کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیتی اور اپنے پیٹ کو جو اب بتدریج نمایاں ہوتا جا رہا تھا کچھ اس طرح تھپتھپاتی گویا وہ اپنے ہونے والے بچے کو ابھی سے پیار کر رہی ہے۔

سب بلقیس کا خیال پہلے سے زیادہ رکھنے لگے۔ بیگم نہال اور جمال بیگم اس کو اونچے نیچے پیر بھی نہ رکھنے دیتیں۔ قدم قدم پر بسم اللہ، اور دلہن سنبھل کر چلو، بیٹی قدم دھیرے اٹھاؤ، کہتیں۔ حد ہے کہ پانی کا بھرا لوٹا بھی اسے نہ اٹھانے دیا جاتا۔

یہ بات انسان اور حیوان کی جبلّت میں ہے کہ وہ اپنی افزائشِ نسل چاہتا ہے۔ باپ بن کر انسان کو یہ خوشی اور فخر ہوتا ہے کہ اس کا وجود اور نسل برقرار رہے۔ اپنی وہ صورت جو وقت کی رفتار سے بگڑ جاتی ہے، انسان اولاد کے آئینہ ہستی میں صاف اور مکرر دیکھنی چاہتا ہے۔ گویا یہ اس کا ایک اور پیکر، ایک اور شبیہہ ہے اور اپنی اس آفرینش کاری کے زعمِ باطل میں سمجھتا ہے کہ سلسلۂ انسانی ابد تک چلتا رہیگا اصغر بھی اس بات پر نازاں تھا کہ نئے انسان کو وجود میں لا کر نہ صرف اپنی ذات کا ماحصل مل رہا ہے بلکہ وہ باپ کہلائے گا اور یہ بچہ عصائے پیری بن کر سہارا دے گا اور آئندہ اس کا نام چلانے والا بھی ہو گا۔

بلقیس اور اصغر کا بیشتر وقت اپنے ہونے والے بچے کی باتیں کرتے ہوئے گزر جاتا۔ ابھی سے اصغر نے بیٹے کا نام بھی تجویز کر لیا تھا اور اس کے مستقبل کے بارے میں وہ دونوں بڑے بڑے منصوبے بناتے، کس طرح اس کو اچھے پیمانے پر

تعلیم و تربیت دیں گے اور ایسی کوئی خامی اس میں نہ رہنے دیں گے جو ان کے والدین کی کوتاہ بینی اور سختی سے ان میں رہ گئی تھی۔

بلقیس اب تک اصغر کو اپنا خدائے مجازی بنا کر پوج رہی تھی مگر اب وہ اپنے شوہر کو اپنے آنے والے بچے کا باپ سمجھ کر دیکھتی تو اس کا دل احسان مندی سے معمور ہو جاتا۔ ماں بننا تکمیلِ نسوانیت ہے اور عورت کی قدرتی اور سب سے پہلی خواہش جب سے بلقیس کی محبت میں منت و مشکوریت کا نیا زمندانہ عنصر شامل ہوا تھا اس کو اصغر پہ بے ساختہ پیار آنے لگا تھا گویا اصغر نہ ہوتا تو وہ ماں کہلانے کی ازلی تمنا سے محروم رہتی۔ وہ خلافِ عادت اب اکثر اس کے بالوں میں اپنی ریشم جیسی انگلیاں ڈال کر کھیلتی۔ کبھی اس کے رخساروں سے اپنے رخسار ملتی اور بعض اوقات اس کے گلے سے وارفتہ ہو کر لپٹ جاتی۔ اصغر بلقیس کے اس بدلے ہوئے رویئے پہ نہ صرف مسرور تھا بلکہ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی سوغات بھی بیوی کو لا کر دیتا اور اس طرح بلقیس کی محبت وصول کرتا، اس نوع اصغر کی تشنگی اور خواہشات کی تکمیل بھی ہوتی رہتی۔

❊ ❊ ❊ ❊ ❊

دن گزرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ مہر و ز مانی کی شادی نزدیک آ گئی۔ گھر میں پھر ہما ہمی نظر آنے لگی۔ اس عرصہ میں بلقیس کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی۔ مگر مرزا شہباز بیگ بہت علیل تھے اور وہ اپنے میکے چلی گئی۔ لیکن مایوں سے چار روز پیشتر بیگم نہال نے بہو کو بلوا لیا۔

مہرو کی شادی میں اتنے مہمان تو نہ تھے جتنے اصغر کی دفعہ مگر پھر بھی اچھے خاصے لوگ تھے کنبہ والوں ہی سے گھر بھر گیا۔ مہرو کو مایوں بٹھایا جا چکا تھا اور نکاح سے ایک دن پہلے برات بھی بھوپال سے آ گئی۔ سب لوگ لینے گئے۔ مسرور وہاں

سے واپس آکر سیدھا مہرو کی صحنچی میں پہنچا اور کہنے لگا:

"مجھے بہت کہتی تھیں کالا کلوٹا، لو تمہارے دولھا تو کالے بھجنگ بالکل الٹے توا ہیں۔ سچ ــــ میں جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ بڑے بدصورت ہیں دولہا بھائی ایک کان تو ندارد ہے۔ مجھے تو کن کٹے دیو معلوم ہوتے ہیں۔ قد دیکھو تو راون کے راون۔"

مہرو نے بگڑ کر اس کو ڈانٹا:

"تم کو شرم نہیں آتی مجھ سے ایسا مذاق کرتے ہو۔ جاؤ یہاں سے ورنہ ابھی..."

اور مسرور وہاں سے یہ کہہ کر اٹھ گیا: "تم چاہے غصہ ہو لو۔ مگر دیکھ لینا میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

مسرور کے جانے کے بعد تو مہرو کچھ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ روتے روتے حال سے بے حال ہو گئی۔

عصر مغرب کے درمیان نکاح تھا جب برات آئی تو میر نہال نے اپنے ہونیوالے داماد کو پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی ان کے سینہ پر گھونسا سا لگا۔ مسرور مذاق نہیں کر رہا تھا۔ معراج واقعی بدصورت تھا کالا رنگ اور ایک کان سرے سے غائب جو شکار میں غلطی سے بھری بندوق کی لبلبی دب جانے سے اڑ گیا تھا اور گولی کان کے پار ہو کر دماغ میں گھس گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بہتیری کوشش کی مگر گولی نہ نکل سکی اور گولی رہ جانے سے دماغ پر بھی اثر ہو گیا۔

دلّی سے نظر الحسن کئی بار بھوپال معراج کے بر دکھوا کو بھیجے گئے تھے مگر اتفاق ایسا ہوا کہ وہ معراج کو ایک بار بھی نہ دیکھ سکے۔ اس کے بارے میں جو پوچھ گچھ ہوئی وہ خاطر خواہ تھی اور کسی کو یہ شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ عیبی ہوگا۔ معراج کو دیکھ کر میر نہال اس قدر متنفر ہوئے کہ فیصلہ کن انداز میں کہا: "میں اپنی بیٹی ایک پاگل کے حوالے

نہیں کر سکتا۔" اور یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ ندامت، غصے اور رنج سے ان کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ براتیوں کے چہرے ان کے فیصلے سے فق ہو گئے اور سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ دولہا والوں نے میر نہال کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ اپنے انکار کے سامنے کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ باپ تھے اور اپنا حقِ پدری اچھی طرح سمجھتے۔ مہر وان کی سب سے چھوٹی بیٹی اور ان کی جوانی کی آخری نشانی تھی۔ انھوں نے سب کی سنی اَن سنی کر کے ٹکا سا جواب دیدیا۔

حبیب الدین کو بھی معراج کی صورت سے وحشت اور نفرت ہو رہی تھی لیکن وہ معاملہ فہم اور دور اندیش تھے معاملے کی نزاکت پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ برات کو اٹھا دینا تو مشکل نہ تھا مگر اس کے بعد انجام کیا ہوگا؟ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مارنے والے کے ہاتھ تو پکڑے جا سکتے ہیں، کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا تھا۔ لڑکی کا معاملہ تھا۔ یہ تو کوئی نہ دیکھے گا کہ دراصل حقیقت کیا تھی؟ چھری پر خربوزہ گرے یا خربوزے پر چھری نقصان سراسر خربوزہ کا ہے۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد وہ میر نہال کے پاس آئے اور ان کے قدم پکڑ لیے کہ ابّا اجازت دیدیجیے۔

میر نہال کڑک کر بولے:

"تم سب نے مل کر مجھے دھوکا دیا ہے۔ آنکھوں دیکھے مکھی نہیں نگلی جاتی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی معصوم بچی کو اس قزاق کو دیدوں؟ لڑکوں کا کال تھوڑی ہے، اور نہ مجھے بیٹی بھاری ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔

حبیب الدین نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر دُنیا کیا کہے گی؟"

میر نہال غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ یہ سن کر بکھر گئے اور چیخ کر بولے:۔

"چولھے میں جائے دنیا ـــــ تم بھائی ہو۔ تم کو بہن سے زیادہ دنیا کے کہنے کی پڑی ہے۔ میں باپ ہوں۔ میں اپنی بے گناہ بیٹی کے پاؤں پر آپ کلہاڑی نہیں مار سکتا۔ مہرو کا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ نہ عمر نہ صورت۔ لاحول ولاقوت۔"

حبیب الدین باپ کی خوشامد کرنے لگے :

"ابا میاں سوچیے تو سہی۔ اگر اس وقت برات اٹھ گئی تو ہم ہی نکّو بن جائینگے نہ معراج کا کچھ بگڑے گا نہ کسی اور کا۔ سننے والے یہی کہیں گے کہ لڑکی ہی میں کوئی ایسا عیب ہوگا کہ دولہا والے بن بیاہے چلے گئے۔ بیچاری مہرو کہیں کی نہ رہے گی...."

میر نہال کا خون اُونٹ رہا تھا۔ طیش کے عالم میں کمرے میں اِدھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ غم اور غصے سے ان کے ہونٹ بھنچ گئے تھے اور تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے رکے اور حبیب الدین سے کہنے لگے :

"جاؤ ـــ میں ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ اس مردود خبطی کے ساتھ سب کو یہاں سے دفعان کرو۔ میں اپنی بچی کا ہاتھ کسی کنگال کے ہاتھ میں دے دوں گا مگر اس مسخ صورت کو اپنا داماد نہیں بنا سکتا۔ میں اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہوں۔ سن رہے ہو؟ مجھے نہ دنیا کا ڈر ہے نہ کہنے والوں کا......"

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئے۔ حبیب الدین نے اپنی ٹوپی باپ کے قدموں میں ڈال دی اور کہنے لگے :

"ابا میاں میری بات مان جائیے۔ شریفوں کی زبان پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ ہم ان کو زبان دے چکے ہیں۔ للہ آپ خاندان کی لاج رکھ لیجیے۔"

میر نہال نے اپنے پاؤں کھینچ لیے اور ٹوپی اٹھا کر بیٹے کے سر پر رکھ دی مگر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ امڈا چلا آ رہا تھا۔ ان کی خاموشی سے حبیب الدین سمجھ گئے کہ اجازت مل گئی ہے اور وہ اُٹھ کر مہمانوں میں آ گئے۔ مگر

میر نہال کا ضمیر اور ان کی محبت و شفقت سب ان کو بری طرح ملامت کر رہے تھے۔ وہ نکاح میں شریک نہیں ہوئے اور اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے بے بسی، تاسف اور غم کے آنسو بہاتے رہے ان کو معلوم ہو رہا تھا کہ آج انھوں نے اپنی چہیتی مہرو کو خود اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہے.....

مسرور نے ساری اطلاع جاکر مہرو کو دی اور وہ ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔ لڑکیوں کو اپنی قسمت کے معاملات میں جو دخل تھا سو اتنا کہ وہ خاموشی سے آنسو بہالیں ان کے والدین اور ولی وارثوں کو اختیار تھا کہ جس سے چاہیں ان کا پلّہ باندھ دیں۔ ان کے فیصلے کے آگے لب ہلانے کی اجازت نہ تھی اور مہرو کی حالت ایک مجبور و زخمی اسیر پرندے کی سی تھی۔ رونمائی ہو جانے کے بعد معراج کی صورت دیکھ کر پرائے گھر جانے کے وہ پُرکیف خواب سب خاک میں مل گئے اور محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بے زبان گائے کی طرح قصائی کی چھری تلے کھڑی ہے۔ خوابوں کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ حقیقت نے بے حوصلہ کر دیا اور اس نے اپنے مقدر سے چپ چاپ ہار مان لی۔ احساسِ شکست کے ساتھ ایک طرح کا سکون آگیا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

باہر جو ہنگامہ ہوا تھا اس کے مد و جزر کی زنانخانے میں بھنک بھی نہ گئی۔ ڈومنیاں سہاگ گاتی رہیں۔ بیویاں شادی میں شریک ہونے آئی تھیں۔ اس خوشی کی تقریب میں انھیں صرف اپنی زیب و زیبائش کی نمائش و نمود مقصود تھی جہاں وہ دوسروں کا اہتمام لباس دیکھ رہی تھیں اور اپنا دکھا رہی تھیں۔

آج بلقیس نے اپنا چوتھی کا سبز اور اودا جوڑا پہنا تھا۔ گلبدن کے کرنے دوپٹے میں اس کا کندن جیسا جسم چمک اٹھا تھا اور حسن تھا کہ پھوٹا پڑتا تھا۔ اس نے اونچی

ایڑی کی ولایتی جوتیاں جو اصغر نے تحفۃً لا کے دی تھیں پہن رکھی تھیں سسرال والیوں کی نظر جب اس کے ولایتی منڈدں پر پڑی تو تلملا کر جلی کٹی سنانے لگیں،

"ہے ہے بھابو تم نے دیکھا اصغر میاں کی دلہن کو؟ باون گز او نچے موئے کافروں کے جوتے پہن رکھے ہیں۔"

"ہاں بی خوب دیکھے۔ ابھی تو تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو نئی روشنی کی ہیں۔ آسمان میں تھگلی لگائیں گی۔"

ایک بڑی بی جنھیں اصغر کو اپنا نواسہ داماد بنانے کی آرزو تھی جل کر بولیں،

"اے مرزا شہباز بیگ کی بیٹی سے اور کیا توقع ہوگی۔ بیوی ان کا تو پورے کا پورا گھرانا موئے فرنگیوں کی بیٹ کھا گیا ہے۔"

غرض بلقیس جدھر سے گزرتی زہر میں بجھی پھبتیاں سنائی دیتیں۔ دراصل وہ اس کو سنانے کے واسطے کہی بھی جا رہی تھیں۔ یہ طعنے اگر اس کی ذات تک محدود ہوتے تو خیر مگر اس کو اپنے باپ اور خاندان کا سن کر بہت کھلا۔ مگر پورا سسرال موجود تھا۔ کس کس کو جواب دیتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تو آئے لیکن وہ اپنے کو ضبط کر کے پی گئی۔

مہر و وداع ہو چکی تھی۔ جانے والے مہمان چلے گئے۔ جو ٹھہرے وہ کھانا کھا کر جدھر جگہ ملی پڑ کر لمبی تانے سنا رہے تھے۔ بلقیس کا سارا لطف بیویوں کے طعنے سن سن کر کرکرا ہو گیا تھا۔ صبح سے سنتے سنتے اس کا دل پک چکا تھا اور جب رات گئے وہ کوٹھے پر گئی ہے تو اصغر اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اصغر کو دیکھ کر وہ سبک سبک رونے لگی اور سب کی کہی ہوئی باتیں دوہرائیں اصغر کو بھی سن کر بہت برا لگا، لیکن سوائے بیوی کی دل جوئی کے وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا، اور کہنے لگا۔

"ارے چھوڑو۔ جاہلوں کی باتوں پر کان ہی کیوں دھرتی ہو۔ تم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ تم پر اور تمہارے کپڑوں پر ان کو رشک آیا جب ہی تو جل جل کر تم کو سنائیں اور پھر بھی کچھ دن کی بات ہے۔ جیسے ہی مجھے ملازمت مل گئی۔ میں الگ گھر لے لوں گا جہاں ہم دونوں مل کر اطمینان سے ہنسی خوشی رہیں گے، چلو اب تو ہنس دو" اور وہ اس کو گدگدانے لگا۔ بلقیس روتے روتے مسکرا دی۔

۵

اصغر نے کئی جگہ درخواستیں دے رکھی تھیں مگر ابھی تک کوئی قابلِ قبول ملازمت نہ مل سکی تھی، اور وہ اسی چکر میں پریشان اور سرگرداں نظر آتا۔ حبیب الدین نے اس کو متفکر دیکھ کر ایک دن کہا:

"بھئی کہو تو میں ڈپٹی کمشنر سے تمہارے متعلق گفتگو کروں۔ میرے ان سے اچھے مراسم ہیں۔ ویسے میں پولیس کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بھی بخوبی جانتا ہوں اور ان کی سفارش سے تمہیں پولیس کے محکمہ میں اچھی نوکری مل سکتی ہے۔"

لیکن اصغر کو سرکاری ملازمتوں میں قطعی دل چسپی نہ تھی اور اس نے جواب دیا:

"نہیں آکا بھائی، میں سرکاری نوکری سرے سے کرنی ہی نہیں چاہتا۔ کون اپنی خودداری گنوائے اور افسروں کی جی حضوری میں ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔ مجھ سے تو کسی کی چاپلوسی ہوتی نہیں۔ دوسرے ساری عمر خانہ بدوشوں کی طرح خاک چھانتے پھرو۔ آج یہاں اور کل وہاں چھوٹی چھوٹی تحصیلوں میں تعینات ہو کر قصبوں میں رہو جہاں نہ کوئی

ملنے جلنے والا نہ دوست احباب، اور ملازمت کے بعد پنشن کے وہی ڈھاک کے تین پات لے کر گھر بیٹھ جاؤ۔"

اس پر حبیب الدین بولے:

"میاں آج چاہے کوئی اعتراض کرو مگر بعد میں سرکاری ملازمت نہ کرنے پر پچھتاؤ گے۔ سرکار کا نمک خوار ہو کر کم از کم رعب داب، عزّت، اثر رسوخ تو ہوتا ہے پھر مستقل بندھی بندھائی آمدنی گھر بیٹھے آتی رہتی ہے۔"

اصغر نے کہا:

"جی نہیں۔ میں تو اپنا ہی کوئی دھندا شروع کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں آج کل تجارت میں بڑھنے کے زیادہ موقعے ہیں۔ اور ایک دفعہ کام جم جائے تو روپیہ بھی بہت ہے۔"

حبیب الدین یہ سن کر چپ ہو رہے۔

اصغر اور باری دونوں سے ساتھ مل کر الگ کاروبار کرنے کی فکر میں تھے اصغر کو نفیس لباس کا شوق تھا اور وہ ہمیشہ عمدہ سلے ہوئے کپڑے پہنتا بھی تھا۔ لہٰذا باری سے ایک دن کہنے لگا:

"یار! میرے خیال میں درزی کی دوکان اچھی رہے گی۔"

باری اس پر بولا:

"میاں نہ تم درزی نہ میرا باپ درزی۔ کپڑے کتر بیونت کون کرے گا؟ اور درزی تو نانی کے کفن میں سے بھی چرا کر ٹوپی سی لیں۔ اماں کچھ اور سوچو۔"

اصغر نے دماغ پر زور ڈالا اور سوچ کر کہا:

"ہاں کہتے تو ٹھیک ہو۔ پھر جوتوں کی تجارت موزوں رہے گی بنے بنائے ولایتی جوتے منگوا لیا کریں گے۔"

باری نے یہ سن کر بھرپور قہقہہ لگایا اور جواب دیا:

"واہ میرے یار۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ حضرت کیا شاہ بڑے پر بھنگ گھونٹ کر دم لگانے لگے ہو جو دماغِ عالی اونچی اڑان کر رہا ہے۔ میاں گراہکوں کے سڑے بھسے گندے پاؤں میں جوتے تم پہنایا۔ یار خاں تو حاجی جی بنے شان سے گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے رہیں گے۔ البتہ اگر کوئی آ گیا سجیلا چٹ پٹا تو اپنے پیر پر پٹاخ سے ہاتھ مار کر مفت جوتا پہنوا دیں گے۔"

اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور یہ تجویز بھی آئی گئی ہوئی۔ اسی طرح تمام تجویزیں ادھوری رہ جاتیں اور دونوں اِدھر اُدھر ٹاپک ٹوئیاں مارتے اور عقل کے گھوڑے دوڑاتے۔ دونوں ناتجربہ کار تھے۔ محض زبانی جمع خرچ تو آتا تھا لیکن حقیقتاً کوئی کام کبھی عملاً نہ کیا تھا۔ کئی ایک بیوپاریوں سے تجارت پر گفتگو ہوئی بھی مگر ہر ایک نے کچھ اس قدر ہیر پھیر کی بتلائی کہ دونوں نے عاجز آ کر تجارت کا خیال سرے سے چھوڑ ہی دیا۔ لیکن اصغر کو ایک دیسی کمپنی میں اچھی شرائط اور معقول تنخواہ پر ملازمت مل گئی جو مرزا شہباز بیگ کے ذاتی اثر اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اصغر خوش تھا کہ ساری سوئیاں نکل گئیں اور بلقیس اس خیال سے خوش تھی کہ اب اس کا اپنا گھر الگ ہو جائے گا۔

بلقیس کو اَن گنا مہینہ لگ چکا تھا۔ بیگم نہال تو یہی چاہتی تھیں کہ بہو کی پہلی زچگی سسرال میں ہو لیکن سمدھن اور بیٹے کی ایما یہ تھی کہ بچہ میکے میں ہو۔ لہٰذا بیگم نہال نے جو چھوٹے موٹے سوزنیاں نہالچے اور کرتے ٹوپی سیے تھے وہ سب بقچی میں باندھ کر بہو کے حوالے کر دیے۔ اور بلقیس اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔

شہباز بیگم نے ستھورا پنجیری بنوا کر اپنے کنبے اور سمدھیانے میں حصے بھجوا دیے جمال بیگم نے ستھورا کھایا اور اسی شام کو جب نیچے اتر کر آئیں تو بیگم نہال سے کہا:

"بی مجھے تو معلوم ہوتا ہے تمہارے اللہ رکھے پوتی ہوگی۔ سٹھورا بڑے مزے کا ہے"
اس پر بیگم نہال بولیں:

"اے بوا پوتا ہو یا پوتی، اللہ کی دین ہے۔ بس اللہ بھاگوان کرے اور نصیبہ والا ہو"

اس بات کو دو روز ہی ہوئے ہوں گے کہ دلچین نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے آکر بیگم نہال سے کہا:

"بیگم صاحب جلدی کیجیے۔ اللہ رکھے دلہن بیوی کے درد لگ گئے ہیں۔ ان کی امّاں نے ڈولی بھیجی ہے آپ کے واسطے"

بیگم نہال یہ سنتے ہی جس طرح بیٹھی تھیں اسی طرح اُٹھ کھڑی ہوئیں اور سارے راستے وہ اپنی بہو کے لیے دعائیں مانگتی رہیں۔

پہلوٹھی کا بچہ تھا۔ بلقیس کو ٹھہر ٹھہر کر درد اُٹھتے اور وہ تکلیف سے چیخیں مارتی اور اس کی ہر چیخ پر اصغر بے چین ہو ہو جاتا۔ عورت کی زندگی میں یہ کتنی کٹھن گھڑی ہوتی ہے، مگر بلقیس آسانی سے فارغ ہو گئی اور بیگم شہباز اور بیگم نہال ایک دوسرے کو مبارک باد دیتی ہوئی دالان میں آکر بیٹھ گئیں۔ چنبیلی نے اصغر سے کہا:

"مبارک ہو میاں چاند سی بیٹی کے ابا ہو گئے"

وہ بیٹی ہونے کی خبر سن کر مایوس ضرور ہوا کیونکہ اس کو بیٹے کی ولادت کا پورا یقین تھا، لیکن خیر وہ کشمکش تو ختم ہو گئی۔ دائی نے بچی کے کوئی پھریری اور بیسن سے نہلا دُھلا کر رضائی میں لپیٹ دادی کی گود میں لا کر ڈال دیا۔ وہ نہال ہو رہی تھیں اور پوتی کو کلیجے سے لگا کر سمدھن سے پوچھا:

"اے بی اذان کون دے گا؟"

"اس کے نانا دیں گے" اور شہباز بیگم اٹھ کر شہد کی شیشی اٹھا لائیں اور

نواسی کو لے کر صحنچی میں چلی گئیں جہاں مرزا شہباز بیگ لیٹے ہوئے تھے۔ مرزاجی بیمار تو کافی عرصے سے تھے مگر کچھ دنوں سے تو وہ چل پھر بھی نہ سکتے تھے۔ انھوں نے نواسی کے کان میں اذان کہہ کر شہد چٹا دیا۔ بچی نے ذرا سا منہ کھولا، پہلے تو شہد چاٹ لیا اور اس کے بعد بُرے بُرے منہ بنا بنا کر رونا شروع کر دیا۔

دائی بلقیس کو صاف ستھرا کر کے آرام سے لٹا چکی تھی۔ پان کلّے میں دبا کر بچی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اللہ قسم صبح سے یہ وقت ہو گیا۔ اتنے میں تو محلّے بھر کو جنا دیتی۔ یہ لڑکیاں بہت ہلکان کرتی ہیں۔"

اور وہ برقعہ سر پر ڈال کے جانے کو کھڑی ہو گئی۔ "کل تڑکے آؤں گی۔ زچّہ کو کچھ کھلانا پلانا نہیں۔ بس ملکو کا عرق دینا۔" پھر چلتے چلتے اصغر سے بولی:

"میاں تم سے ایک ریشمی جوڑا اور سونے کے کڑے لوں گی۔"

اصغر کو جب کمرے میں جانے کی اجازت ملی تو بلقیس اُجلے اُجلے اور صاف ستھرے بچھونے پر کامدانی کی اودی رضائی اوڑھے لیٹی ہوئی تھی اور اس کے سر پر ریشمی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اودے رنگ میں اس وقت اس کا چہرہ کوری ململ کی طرح سفید نظر آ رہا تھا۔ اصغر کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ میں محبت سے زیادہ ماں بن جانے کی خوشی تھی۔ اصغر ہلکے سے پٹی پر بیٹھ گیا۔ بلقیس نے اپنے نازک ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے لیا اور گرمجوشی سے دبایا۔ اصغر اس کی پیشانی کو چومنے جھکا اور اس کا دل اچانک مضطرب ہو کر دھڑکنے لگا۔ باپ بن جانے کا احساس کتنا عجیب تھا اور یہ جذبہ کتنا انوکھا۔

خبر ملتے ہی ہیجڑے اور بھانڈ زور زور سے تالیاں پیٹتے، "اے اللہ کی امان، میں واری میں صدقے زچّہ بچّہ کی خیر" کرتے ہوئے آ گئے، اور مٹکتے

ہوئے زچہ گیریاں گانی شروع کردیں۔ رک رک کر درمیان میں ایک کہتا: "اے نانی پیاری کو بلاؤ۔ نواسوں والی ہوں، آج تو سونے کے کنگن پہنوں گی۔ اے صدقے گئی دادی اماں کو بلاؤ۔ سوا سو بیل لوں گی!" اور پھر زچہ بچہ کی نقلیں اتارتے ایک کھڑا ہو کر ڈھولک پیٹتا اور ایک گھونگھٹ نکال کر بے ڈھنگے پن سے اونگے بونگے پیر اٹھا اٹھا کر چھم چھم ناچتا اور باقی بل کر اپنی مردانی بھونڈی آوازوں سے پوری قوت سے گلے پھاڑ کر گاتے۔ لونڈے لاری جمع ہو گئے۔ اور محلے کی عورتیں دیواروں پر چڑھ چڑھ کر اپنی چھتوں سے ان کا تماشا دیکھنے لگیں۔ بیگم نہال نے آخر بیس روپے بیل دے کر ان کو رخصت کیا۔

چلہ نہانے تک بلقیس کے کمرے میں ہر وقت کالے دانے کی دھونی جلتی رہتی اور دھواں اندر بھر کر باہر تک پھیل جاتا۔ کالے دانے سے بچی کی پیشانی پر کبھی نندگزر کی ٹیکی لگا دی جاتی اور وہ ماں کے گرم گرم پہلو میں بے خبر سوتی رہتی۔ بلقیس کبھی کبھی اس کے ریشم جیسے بالوں پر مہر و محبت سے ہاتھ پھیرتی، بچی کلبلاتی چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں کو مروڑ کر انگڑائیاں لے کر منہ سا منہ بسورتی اور بلقیس جلدی سے اس کے منہ میں دودھ دے دیتی اور جب بچی کے گرم اور ملائم لب بند ہوتے اور کھلتے اور چھاتیوں سے دودھ کی دھار کھنچتی تو ایک عجیب سی سنسنی اس کے سارے جسم میں دوڑتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں جا کر ختم ہو جاتی اور بلقیس ممتا کے جوش میں دوسرا ہاتھ بچی پر رکھ کے مطمئن ہو کر سو جاتی۔ ماں بن جانے کے بعد کتنا روحانی سکون اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔

نورتن اور گود بھرائی ہو چکی اور بلقیس چلہ نہالی تو وہ پاؤں پھیرنے اپنی بچی جہاں آرا کو لے کر میکے سے سسرال آ گئی۔ مرزا شہباز بیگ کی طبیعت زیادہ بگڑتی جا رہی تھی اور وہ پلنگ سے لگ گئے تھے۔

اتنے میں بقرعید سر پر آگئی۔ گلی میں ہر دروازے کے سامنے بکرے دُنبے اور مینڈھے بندھے ہوئے تھے اور محلے میں چاروں طرف سے بکروں کے بھیں بھیں کرنے کی کرخت آوازیں آتیں۔ میر نہال عید سے پندرہ دن پہلے خود چوک جا کر قربانی کے لیے دُنبے لے آئے۔

عید کی صبح کو میر نہال، اصغر اور مسرور نماز پڑھنے چلے گئے، اور واپس آکر قربانی کی۔ تین دن تک جو ہر گھر میں قربانیاں ہوئیں تو نالیوں میں خون بہہ بہہ کر ناگوار سڑاند اُٹھنے لگی۔ جگہ جگہ موریوں کے کنارے اوجھڑیاں اور آلائش نظر آتی اور بکروں کی کھالوں کے ڈھیر دکھائی دیتے۔ چماریاں دست اور رانوں کے حصے گھر گھر لاتی لے جاتی دکھائی دیتیں۔

چونکہ مرزا شہباز بیگ کی حالت نازک ہوگئی تھی اور چل چلاؤ معلوم ہوتا تھا لہٰذا عید کے دوسرے روز ہی بیگم نہال نے بہو سے کہا:

"بیٹی خیر سے تم اپنی ماں کے ہاں چلی جاؤ تمہارے ابا کی طبیعت خراب ہے۔"

اور عید کے چوتھے روز گجردم اذانوں کے وقت مرزا شہباز بیگ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

بیگم نہال اور بیگم جمال ان کے انتقال کی خبر سن کر پُرسے کو پہنچیں۔ اصغر کفن دفن کے انتظام میں باہر ہی باہر پھر رہا تھا۔

بلقیس کی چھوٹی بہن زہرا کے پاس یہاں آرہی تھی اور میرزا شہباز بیگ کی بیوی صحنچی میں بیٹھ موڑھے بیٹھی ہوئی بیوڑی کچوری کا ناشتہ کر رہی تھیں۔ پُرسے کو آنے والے خاموشی سے جا جا کر دالان میں بیٹھ جاتے۔ جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہوکر شہباز بیگم نے ہاتھ منہ صاف کیا اور سب کے پاس آکر بیٹھ گئیں، اور بیویوں کے ساتھ مل کر اپنی بیوگی پر رونے اور اپنے سہاگ اجڑنے پر ماتم کرنے لگیں۔

بلقیس پر البتہ بہت اثر تھا اور وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی....

* * * * * *

مرزا شہباز بیگ کا چالیسواں ہوتے ہی اشفاق کلکتہ چلے گئے۔ ان کا جانا ازبس ضروری اس لیے تھا کہ مرزا جی کا اصل کاروبار کلکتہ میں پھیلا ہوا تھا اور جب وہ حیات تھے تب بھی اشفاق ہی اس کے کرتا دھرتا تھے۔ بندو تو باپ کے انتقال کے ہفتہ بھر بعد ہی رام پور چلا گیا جہاں اس کو ملازمت مل گئی تھی۔ اب لے دے کر مردوں میں اصغر ہی رہ گیا تھا جو مرزا شہباز بیگ کے مرنے کے بعد ان کی بیوی کی خبر گیری کرتا اور گھر بار سنبھال سکتا۔ چنانچہ اس نے ساس کی دیوار سے ملحق جو مکان تھا وہ کرایہ پر لے لیا اور اپنے نئے گھر کو حسب ذوق مغربی طرز پر سجایا، جو وہ میر نہال کے ڈر سے ان کے گھر میں نہ کر سکتا تھا۔ میز کرسیاں خریدیں، پردے لٹکائے، دیواروں پر مناظر کی تصویریں۔ میزوں اور کارنس پر گلدان رکھے اور سگریٹ کی راکھ دانیاں۔

اپنے نئے گھر کی الٹ پلٹ اور اس کو جمانے سجانے میں بلقیس باپ کی جدائی کو ایک حد تک بھول گئی۔ اصغر تو صبح ناشتہ کر کے دفتر چلا جاتا اور بلقیس بیچ کی دیوار کی کھڑکی کھول کر جو ماں اور بیٹی کے گھروں کو ملاتی تھی اور دونوں میں ادھر سے ادھر آنے جانے کے لیے راستے کا کام دیتی تھی، اپنی بچی کو لے کر ماں بہن کے پاس چلی جاتی اور اصغر کے لوٹنے کے وقت سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ پیشتر اپنے گھر آجاتی۔ کنگھی چوٹی کر کے "نیا رہوتی" اور شام کی چائے اور رات کے کھانے کا بندوبست کرتی۔

شام کو اکثر اصغر کا کوئی نہ کوئی ملاقاتی آجاتا۔ کبھی کبھی کبیر الدین اور حبیب الدین کے بچے چچا کے سلام کو آجاتے۔ نسیم اب چھٹے برس میں تھا اور مکتب میں بٹھا دیا گیا

تھا۔ ملقیس بچوں سے باتیں کرتی۔ ان کو چھوٹے موٹے کھلونے اور بسکٹ مٹھائی دے دیا کرتی جس سے وہ خوش ہو جاتے۔ کبھی اصغر کی طبیعت حاضر ہوئی اور چچا بننے کی موج آئی تو ساتھ لے جا کر رنگین منپلیں اور کاپیاں دلوا دیں۔

ایک دن اتوار کو اصغر ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ سعید حسن آ گئے۔ انھوں نے کنڈی کھٹکھٹا کر کہا: "میں ہوں سعید حسن" اور اصغر جلدی سے اپنا عنابی رنگ کا پھولدار ریشم کا ڈریسنگ گاؤن پہن کر ان کی پیشوائی کو آیا۔ سعید حسن آج بھی ہمیشہ کی طرح چونچال تھے۔ مہرو سے انکار ہو جانے پر نہ وہ مایوس ہوئے اور نہ شادی کا شوق کم ہوا تھا۔ بلکہ ہر رشتے کنبے والوں کے ہاں جہاں بھی شادی کے قابل کوئی لڑکی ہوتی اپنا پیغام بھجوا دیا کرتے۔ آج کل انھوں نے میر نصیر الدین کی بیٹی ثریا کے واسطے رقعہ بھیج رکھا تھا۔ جوں ہی ان کی نظر اصغر کی بھڑکیلی ڈریسنگ گاؤن پر پڑی تو وہ اس وضع کے لباس کو دیکھ کر چونکے اور کہنے لگے:

"بھئی یہ چغہ تو بہت عمدہ پہنے ہوئے ہو۔ کہاں سے لیا؟"

اصغر نے ان کو ملاقاتی کمرے میں لا کر بٹھاتے ہوئے جواب دیا:

"للہ چغہ کہہ کر اس کی توہین نہ کیجیے، یہ ڈریسنگ گاؤن ہے، ڈریسنگ گاؤن چغہ نہیں۔"

سعید حسن ڈریسنگ گاؤن کے کالر کو ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے اور اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ بیٹھنے کے بعد سعید حسن نے اطمینان سے پورے کمرے پر نظر ڈالی اور ہر چیز کا جائزہ لیا۔

"اخاہ یہ ٹھاٹھ ہیں۔ بالکل صاحب بہادر بن گئے!" پھر تھوڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد پوچھنے لگے:

"کیوں صاحب آپ نے بڑے میاں کو بھی چھٹی دے دی اور بڑی بی کو

بھی رخصت کر دیا ہے۔"

"کون سے بڑے میاں، دولہا بھائی میں سمجھا نہیں۔" اور سعید حسن ایک تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے تجاہلِ عارفانہ سے کہنے لگے:

"میاں وہی بچارے بزرگوار تخت اور بیچاری چاندنی۔ اب تو تمہارے کمرے میں میم صاحب کا راج معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو ان کی سہیلی بی کرسی کس شان سے کونے میں بیٹھی ہیں۔"

اصغر نے کونے والی کرسی کو دیکھا اور اسے سعید حسن کی باتوں پر ہنسی آ گئی۔

"تو آپ کو اس سے کیا بغض ہے آخر؟"

"نہیں بھئی۔ مجھے نہ کسی سے بغض ہے نہ عناد۔ بس اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کنوئیں سے نکل گئے۔ ولایت کی ہوا لگ گئی۔ تھوڑے دنوں میں تم ہم سے گٹ پٹ گِٹ پٹ کرو گے۔ خیر۔ چلو تم فیشن ایبل جنٹلمین تو بن گئے۔"

"نہیں دولہا بھائی میں بچارا غریب آدمی ہوں، جو تھوڑا بہت کمایا کچھ کھایا پیا کچھ اوڑھ لیا کچھ بچا لیا۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔" مگر وہ اس خیال سے جی ہی جی میں خوش تھا کہ یہ سب چیزیں ان کی نظر میں تو آ گئیں۔

سعید حسن نے ٹہل ٹہل کر سجی ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھیں، دیوار کی تصویروں کا بغور معائنہ کیا اور حد ہے کہ کرسیوں کے اسپرنگ اور گدّے تک ٹٹولے اور پھر چچ چچ کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور کافی دیر تک اصغر کو افسوس اور ملال سے دیکھتے رہے، پھر ایک لمبی اور افسردہ آہ بھر کے کہنے لگے:

"میاں اللہ تم کو یہ سب سامان برتنا نصیب کرے۔ مگر سچ پوچھو تو یہ ولایتی چیزیں دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی۔ ہم لوگ زمین پر سادگی سے بیٹھنے اٹھنے والے اُجلی اُجلی چاندنیاں، جاجم اور گاؤ تکیہ استعمال کرتے تھے اس رہن سہن میں ایک

اداسی اور پھر اس کے کارآمد پہلو نہ دیکھو۔ وہ دنیا جہاں کا کونسا کام تھا جو ہم نیچے بیٹھ کر نہ کرتے تھے۔ کھانا پینا، سونا سلانا، اُٹھنا بیٹھنا۔ زمین پر ہی جنم لیتے تھے اور زمین پر ہی مر جاتے تھے۔ اب تو ہم لوگ اپنی ساری اچھی باتیں چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ہماری تو وہی کہاوت ہے: کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ معلوم ہوتا ہے دنیا سے رسم وفا اٹھتی جا رہی ہے اور سادگی اور وضع داری تو جیسے ناپید ہو گئیں۔"

اور یہ کہہ کر میر عاشق کا قصہ سنانے لگے جن کے نام پر آج تک کوچہ میر عاشق مشہور ہے:

"بچارے بزرگ آدمی تھے۔ جتلی قبر پر رہا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ چہل قدمی کو جامع مسجد سے چاندنی چوک جاتے تھے۔ اور لال کنویں اور چاوڑی سے ہوتے ہوئے گھر واپس آتے تھے۔ وقت کے اتنے پابند تھے کہ گھنٹہ گھڑیاں ملا لو۔ ایک ثانیہ جو کبھی اِدھر سے اُدھر ہو۔ اور راستے میں چند مقام ایسے تھے جہاں وہ گنے گنائے لمحوں کے لیے رکتے۔ جہاں جس کے لیے جتنی دیر پہلی بار تھم گئے زندگی بھر اتنی ہی دیر وہاں ٹھہرتے اور ان کے معمول میں فرق نہ آتا۔ وضع داری کا تو یہ عالم تھا کہ نہ پوچھو بس اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو کر یاد اللہ ہو گئی ہے یا سلام کر لیا ہے چاہے وہ شخص وہاں موجود ہو یا نہ ہو یہ سلام کرتے ہوئے یا سلام کا جواب دیتے ہوئے گزر جاتے یا کچھ دیر کو تھم جاتے۔

لال کنویں پر کچھ کھٹلوے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کو دل لگی سوجھی کہ میر عاشق کو کسی طرح روک کر ان کے معمول میں فرق ڈالا جائے۔ ایک بولا یہ کونسی بڑی بات ہے، کل ہی لو جب وہ ادھر سے گزریں گے، ہاتھ نہ ملایا ہو تو اپنے باپ کا نہیں۔ اور دوسرے دن حسب معمول مقررہ وقت پر جب وہ گزر رہے تھے یہ لڑکا ان کی طرف بڑھا مگر ان کا و۔ رعدغہ تھا کہ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ ہاتھ ملاتا، اور

میر عاشق اپنی دھن میں آگے نکلے چلے گئے۔ یہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور اس کے دوستوں نے کہا: اے جا بڑا اتیس مار خاں بن رہا تھا، ملا لیا ہاتھ؟ اس لڑکے کو بھی ضد آگئی تھی بولا: اگر کل نہ ہاتھ ملایا ہو تو مونچھیں منڈوا دوں گا۔ اگلے روز میر عاشق کو جیسے ہی دیکھا یہ لونڈا بڑے زور سے چلّایا: دُہائی ہے میر عاشق کی میر عاشق نے جونہی سنا کہ کوئی ان کا نام لے کر دہائی دے رہا ہے فوراً رُک گئے۔ لڑکے نے کیا کیا، ان کے رکتے ہی جلدی سے ہاتھ پھیلا کر میر عاشق کی طرف دوڑا اور مدد کے خیال میں میر عاشق نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ لڑکے نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور السلام علیکم کہا۔ میر عاشق نے وعلیکم السلام کہا اور آگے بڑھ گئے۔ لڑکا اکڑتا ہوا اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ بات آئی گئی ہوئی۔

" اتفاق سے اس لڑکے کی کچھ لوگوں سے ناچاقی ہو گئی اور نوبت مار پیٹ مرنے تک پہنچی۔ حریفوں نے کہا اگر ہے تیرا کوئی حمایتی تو بُلا لے، ہم دیکھ لیں گے۔ جب میر عاشق کے کان میں یہ خبر پڑی فوراً سر پر کفن باندھ قرولی سونت اس لڑکے کی مدد کو میدان میں آگئے۔ لیکن بھلا کسی کی مجال تھی کہ ان سے آنکھ اٹھا کر بھی بات کرتا .....

" تو میاں ایسے وضع دار لوگ تھے اور ایسی وضعداریاں۔ ایک ہم لوگ ہیں تھالی کا بینگن، ایک وہ لوگ تھے کہ اگر کسی کو ایک بار دوست کہہ دیا تو مر کے بھی دوست رہے۔ افسوس!"

اصغر کو سعید حسن کے دوشالے میں لپٹے ہوئے طنز سے اذیت پہنچ رہی تھی لیکن نہ سعید حسن ہی اپنی خو بدل سکتے تھے اور نہ اصغر ہی اپنی وضع چھوڑ سکتا تھا۔ ہر نئی چیز کو لوگ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اصغر کو خود اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

دلّی کی شام

۹

جس طرح چاند سورج منزلوں پر منزلیں طے کرتے اور زمین مدار پر گھومتی رہتی ہے اور ستارے سفر کرکے اپنے اپنے برج میں آجاتے ہیں، اسی طرح ہر مہینہ اپنے مقررہ وقت پر آتا اور چلا جاتا یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء ختم ہو کر ۱۹۱۳ء کا آغاز ہو گیا۔ گزشتہ سال دسمبر میں برٹش انڈیا کے وائسرائے بہادر لارڈ ہارڈنگ نے اپنا اقتدار بڑھانے کو دلّی میں ایک نقلی دربار منعقد کیا تھا۔ اس موقع پر کسی نے ان پر بم پھینکا مگر ابھی انگریزوں کا اقبال عروج پر تھا اور وہ بال بال بچ گئے۔ لیکن اس حادثہ کے بعد تو ملک بھر میں طرح طرح کی شورشیں سر اٹھانے لگیں۔ صوبہ بنگال سے خاص طور پر تخریبانہ کارروائیوں کی آئے دن اطلاعیں آنے لگیں اور وہاں دہشت پسندوں کا زور جڑ پکڑنے لگا۔ نہ صرف بنگال ان کی سرگرمیوں سے متاثر تھا بلکہ شدہ شدہ یہ اثر دوسرے صوبوں میں بھی سرایت کر رہا تھا۔

انگریز چاہے کتنے ہی دانا و زیرک کیوں نہ رہے ہوں اور چاہے ان کی قسمت کتنی ہی یاوری کیوں نہ کرتی رہی ہو، مگر یہ حقیقت تھی کہ لوگ اب ان کی

حکومت سے نالاں ہو چکے تھے، اور ایک عام بے چینی سارے ملک میں پھیلتی نظر آتی تھی۔ لوگ انگریزی دور سے شاکی ہو کر تری تری پکارنے لگے تھے۔ یوں تو اس کی وجوہ کئی تھیں لیکن سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ رعیت پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو چکی تھی کہ انھوں نے عنانِ حکومت سنبھالتے وقت جو وعدے وعید کر کے سبز باغ دکھائے تھے دراصل ان کی اصلیت کچھ نہ تھی اور فرنگیوں کے بچھائے ہوئے سنہری دام کی ظاہرا چمک دمک اور اوپری ٹیپ ٹاپ جس سے لوگ مرعوب ہو گئے تھے اور بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں سر بہ سر فریب جلوہ تھی اور حصولِ ملک اور اپنی دولت و قوت اور شوکت بڑھانے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اب ہندی رعایا کے وہ سارے خوابِ خوش حالی تقریباً مٹ چکے تھے۔ امن چین کی امیدیں ٹوٹ گئی تھیں۔ دلوں میں اندیشے بڑھ گئے تھے۔ ہر دم آئندہ مشکلات کا دھڑکا تھا۔ آنے والی کٹھن گھڑیوں کے کھٹکے سے قلوب میں ہل چل تھی اور ذہنوں میں پریشان خیالی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عام پیشنگوئی یہ تھی کہ اب انگریزوں کا زوال قریب آ گیا ہے اور ۱۹۱۱ء جو انگریزوں کی حکمرانی کا نقشِ اوّل تھا اور دورِ عروج، اسی برس میں ان کے استحکام میں دراڑ پڑ گئی تھی۔

دلّی میں بھی اندرونِ شہر میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو رہا تھا۔ وہ بدرَو جو مغلوں کے زمانے سے اب تک زمین دوز چلی آتی تھیں ان کو پاٹ پاٹ کر اس قدر اُتھلا کر دیا تھا کہ گندہ پانی کناروں تک بھرا رہتا اور آلایش ان کے دہانوں سے لگی ہوئی سڑا کرتی۔ محلوں گلی کوچوں میں ناک سڑی جاتی۔ یہ بھی دلّی والوں نے ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیا تھا۔ لیکن جب چاندنی چوک کو چوڑا کیا گیا اور اس کے وہ کہنہ سال پیپل کے درخت جو شاہراہ کے عین وسط میں قطار در قطار صدیوں سے بڑے وقار سے ہرے بھرے کھڑے تھے، کاٹ دیے گئے تو

اُن کے دلوں پر آرے سے چل گئے۔ ان کے خیال میں بازار کی شان ان ہی بلند و بالا درختوں سے تھی۔ ان کی ٹھنڈی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں سینکڑوں انسان آندھی پانی اور برق و باد سے پناہ لیتے تھے۔ ہزاروں دھوپ اور لُو سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ ان کا سایہ لاوارثوں کا آسرا اور بے ٹھکانوں کا ٹھکانہ تھا۔ اور پھر ایک بچھڑے ہوئے زمانے کی یاد ان کی تر و تازگی میں باقی تھی۔ نظریں انھیں دیکھنے کی عادی تھیں آنکھ کھولتے ہی انھوں نے ان پیڑوں کو دیکھا تھا۔ اور وہ کاٹ کر نیست و نابود کر دیئے گئے تھے۔ دلّی کی ساری خوبصورتی ملیامیٹ ہو گئی تھی۔

شہر کے باہر ترکمان اور دلّی دروازے سے پرانے قلعہ اور فیروز شاہ کے کوٹلے تک ایک نئی دلّی کی داغ بیل ڈالنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اہلِ دہلی یہ نئے رنگ ڈھنگ دیکھ بھی رہے تھے اور محسوس بھی کر رہے تھے۔ وہ خطۂ خاک جسے وہ دلّی کہتے تھے صرف ان کا تھا اور ان کو اس سے وہی محبت تھی جو کسی بلبل کو چمن سے ہوتی ہے۔ اور اب دستِ صیاد اس چمن کے نقشے بدل رہا تھا۔ وہ ارضِ وطن جہاں وہ پیدا ہوئے پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے، جس کا چپّہ چپّہ ان کا ہمدم اور رفیق تھا، جس کے در و دیوار ان کے انیس و ہمراز تھے اب اجنبی ہوتی جا رہی تھی۔ سنگ و خشت کے یہ سقف و بام گونگے ضرور تھے مگر اندھے اور بہرے نہ تھے۔ انھوں نے دلّی والوں کا ہر موقع پر ساتھ دیا تھا۔ یہ محراب و مینار ان کے ساتھ ہنسے تھے، ان کے ساتھ روئے تھے۔ دلّی کا ذرّہ ذرّہ اپنے باسیوں کی نس نس سے واقف تھا۔ یہاں کے موسم ان کے مزاج داں تھے اور ہوائیں ان کی نبض پہچانتی تھیں۔ یہاں ان کے عزیزوں کے عزیز مدفون تھے، ان کے آبا و اجداد کی ہزاروں پیڑیاں دلّی کی گلیوں میں حیات و موت سے کھیل کر اسی سرزمین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئی تھیں۔ یہ ان

کی جدّی میراث تھی۔ ان کے جدِ امجد اسی کی راہوں پر جیسے تھے اور اسی کی راہوں پر مٹے تھے اور اس مٹنے میں حیاتِ جاودانہ کا مزا پایا تھا۔ دلّی ان کا حسین خواب تھی اور ان کے خواب کی روشن تعبیر بھی۔ اور اب وہ خواب باطل ہو جائیں گے۔

نئی دلّی کے معنی ان کے نزدیک ایک نیا زمانہ، نئی زندگی اور ایک نئی ڈگر تھے۔ گویا بچے کھچے اور پرانے آثارِ ہستی گم گشتہ بہاروں کے ہم نشیں ہو جائینگے اور قدیم دلّی والوں کی زندگیوں کا حساب بے باق ہو جائے گا اور یہاں وہ لوگ آباد ہو جائیں گے جو اس کی تاریخ سے نابلد ہیں۔ جنہوں نے اس کا دورِ شباب دیکھا اور نہ دورِ خزاں، جن کو اس سے ہر عنوان نہ کوئی تعلق تھا نہ قرب۔ جب سے انگریزوں نے سریر آرائے سلطنت ہو کر دلّی کو اپنا دار الخلافہ قرار دیا تھا ہندوستان کے دور دراز صوبوں سے لوگ آنے لگے تھے اور ان قماش قماش کے پردیسیوں کا طرزِ زندگی جدا تھا، فطرت جدا تھی، ان کی بود و باش، ان کا رہن سہن الگ تھا اور بول چال مختلف۔ ان کو دلّی کی روایات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور ان جدا تہذیبوں اور الگ تمدن کا اثر دلّی پر ہونا لازمی تھا۔ اس کا وہ محاورہ اور اصطلاح، بول چال کی نزاکت و سلاست جس میں دلّی ہمیشہ برتر رہی ہے؛ زبان کی وہ شوخی و رنگینی اور کنائے کے لوچ اور لطافت جن پر اس کو ہمیشہ ناز رہا تھا اب چولا بدل لے گا اور ان کی اچھوتی تہذیب اور عصمت مآب ادائے زندگی داغدار ہو کر وہ حسن و عفت، نفاست و یکتائی جس پر برس ہا برس سے دلّی والوں کو کبر و ناز تھا۔ آخری سانس لے کر دم توڑ دے گی گو وہ خود کبھی کبھی اس سے بیزار ہو کر بے اختیارانہ پکار اٹھتے ہیں:

ہائے دلّی وائے دلّی بھاڑ میں جائے دلّی

لیکن ان کو اس کے ہر ذرۂ خاک سے انس و عشق رہا ہے، اور وہ اس کے دل و جان سے

سیدائی ہیں۔

ساتویں دلّی جو شاہجہان نے آباد کی تھی غارت ہو گئی۔ اس کے کھنڈرات میں جو تھوڑا بہت حسن و جمال باقی رہ گیا تھا وہ انگریزوں کی بنائی ہوئی نئی دہلی کے بعد تغافل شعاریوں کی نظر ہو جائے گا اور دلّی والے اکثر مکدّر ہو کے کہتے، نو دلّی دس باولی قلعہ وزیرآباد.... لیکن زمانہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کون مظلوموں کا دادرس ہوا ہے، اور کب کسی نے برباد ہونے والوں پر آنسو بہائے ہیں؟ وقت کبھی کسی کا ساتھی نہ ہوا، نہ اس نے عہد وفا کیا اور نہ پیمان استوار رکھے۔ نینوا اور بابل اس کی خودغرضیوں پر بھینٹ چڑھ گئے، کارتھیج اور روما وقت کی سنگینی کا شکوہ کرتے ہوئے مذلّت کی گمنام خندقوں میں کھو گئے۔ مگر کون تھا جو ان کا ہمنوا ہوا، کب کسی نے سینہ کوبی کی؟

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

میر نہال اور ان کے ملاقاتی حالات حاضرہ پر غور کرتے اور بحث مباحثے ہوتے اور کوئی تدبیر ازالہ کی تلاش کرتے، مگر سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنا لاحاصل ان کی دلّی اب ان کی نہ تھی، گویا اب زندگی اور تقدیر بھی ان کی نہ رہی تھی اور اس پہ بھی دوسروں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ یہی اصل وجہ تھی کہ میر نہال نے گھر سے باہر نکلنا قطعی چھوڑ دیا تھا، اور وہ گھر میں بیٹھے رہتے۔ ان کی ہستی سبزۂ بیگانہ ہو کر رہ گئی۔ گوشہ نشینی کی بے کیف گھڑیوں میں انھوں نے حکمت اور کیمیا کا سہارا لے لیا۔ کتب اور علم کی دنیا میں یہ اطمینان تو تھا کہ نہ کوئی دخل انداز تھا نہ کسی کی دسترس۔ اس سے جو وقت میسر آتا وہ پوتوں سے ہنس بول کر گزارتے۔ یہ ناسمجھ بچے ہی ان کا سامانِ مسرت اور دل بہلاوے کا واحد ذریعہ تھے۔

کبیر الدین کے دو بیٹے حمید اور شاہد تھے جن کی عمریں آٹھ اور دس برس کی تھیں۔ مگر میر نہال حبیب الدین کے بیٹے نسیم کو زیادہ چاہتے تھے۔ وہ حمید اور شاہد سے عمر میں

کافی چھوٹا تھا لیکن ان دونوں سے زیادہ ذہین اور فراست والا۔ لاڈ پیار نے اس کو اور شوخ اور جری بنا دیا تھا، اور وہ اس قدر چلبلا ہو گیا تھا کہ ذرا دیر نچلا نہ بیٹھتا۔ جب کھیلتے کھیلتے تھک جاتا تو کسی کونے میں یا سیڑھیوں پر خاموش بیٹھ کر شہزادیوں اور پریوں کے خیال میں گم ہو جاتا اور پرندوں اور جانوروں کی عجیب عجیب صورتیں اپنے ذہن میں ترتیب دیتا۔ اور جب تخیلات کے پُر اسرار جہانوں کی بھول بھلیوں سے نکلتا تو بھونڈی آواز سے بے سر و پا نظمیں گاتا پھرتا جن میں سے بیشتر اس کی اپنی بے معنی تک بندیاں ہوتیں۔ اس کو مکتب میں بٹھا دیا تھا مگر روز روز استانی جی کے پاس جا کر پڑھنا جان پر آتا تھا، اور عربی اس کو ایک جناتی زبان معلوم ہوتی۔ جب وہ استانی کے ہاں سے واپس آتا تو میر نہال اس کو اُردو کا سبق دیتے اور نرسل کے قلم خود تراش کر قط لگاتے اور تختی لکھوا کر خوش خطی کی مشق کراتے وہ نہ صرف مشفق دادا تھے بلکہ مہربان استاد بھی جو بہت تحمل اور شوق سے اس کو درس دیتے عموماً نسیم اپنا سبق دلجمعی سے یاد کرتا، فر فر کہانیاں سناتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کھیل میں پڑ کر وہ پڑھنے پر قطعی دھیان نہ دیتا تو البتہ میر نہال سخت سست کہہ دیتے۔

گرمیوں کی دوپہروں میں ایک ایک بچّہ ان کے پاؤں باری باری دباتا جب میر نہال قیلولہ سے فارغ ہو کر اٹھتے تو عصر کی نماز پڑھ کر سب بچّوں کو اپنے پاس بلا لیتے اور چائے کی تیاری ہوتی۔ انھیں سبز چائے بہت بھاتی تھی اور غفور سماوار میں آگ جلا کر پانی بھر دیتا۔ بقیہ اہتمام وہ خود کرتے۔ پتیاں اور دودھ ساتھ ڈال کر اَوٹاتے۔ جب اس کا رنگ گلابی ہو جاتا تو الائچی اور دار چینی بھی شامل کر دیتے اور بھاپوں کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو نکلنے لگتی۔ پھر غفور دیوار میں جڑی ہوئی الماریوں میں سے نیلے رنگ کے چینی کے پیالے اور گہرے چمچے نکالتا۔ یہ میر نہال کی خاص اور

پسندیدہ چیزیں تھیں۔ پیالوں کے اندر اور باہر دونوں طرف پہاڑ اور درخت یا پھول پتیاں بنی ہوئی تھیں اور چمچے بھی انھیں سے ملتے جلتے تھے۔ میر نہال سماوار کی ٹونٹی کھولتے اور سب بچوں کے پیالے باری باری چائے سے بھر دیتے ـــــ بچے کرارے بھر بھرے پاپے پیالوں میں ڈبو دیتے جو چائے میں بھیگنے کے بعد پھول جاتے، اور وہ ان کو چینی کے چمچوں سے نکال نکال کر بڑے شوق سے کھاتے۔ اس وقت میر نہال دنیا کی تلخیاں اور زمانے کی زیادتیاں سب بھول جاتے اور خاموش بیٹھے ہوئے ایک خاص سکون سے پوتوں کو چائے پیتا ہوا دیکھتے رہتے۔ ان کا چہرہ پُرمسرت ہوتا اور آنکھوں میں محبت۔

حمید اور شاہد دادا سے ذرا ڈرتے تھے اور جب انھیں چورن چاہیے ہوتی تو نسیم کو جو میر نہال کا منہ چڑھا تھا قاصد بنا کر بھیجتے اور خود ڈیوڑھی میں کھڑے رہتے نسیم دادا کے پاس جا کر کہتا:

"اچھے دادا آبا تھوڑا سا چورن دیدیجئے۔"

میر نہال غفور سے کہتے:

"چورن کی شیشی تو لانا"

اور چٹکی بھر کے چورن نسیم کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ لیکن نسیم کہتا:

"نہیں دادا آبا تھوڑا سا اور دے دیجیے۔"

میر نہال کہتے:

"نہیں، چورن زیادہ نہیں کھاتے۔"

مگر وہ دادا کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا رہتا اور میر نہال پوتے کی ضد سے عاجز آکر نا چار شیشی کا ڈھکنا پھر کھولتے اور اس کی ہتھیلی پر پہلے سے زیادہ چورن

ڈالتے ہوئے جھوٹ موٹ بگڑ کر کہتے:

"بس جاؤ۔ اب اور نہیں ملے گا۔ زیادہ چورن کھانے سے آنتیں کٹ جاتی ہیں۔"

نسیم اچھلتا ہوا باہر آجاتا۔ حمیدا اور شاہد جو پہلے سے اس کے منتظر کھڑے ہوتے نسیم کو پکڑ لیتے۔ چورن آپس میں بٹ جاتا اور وہ چٹخارے لے لے کر کھاتے۔ جب چورن ختم ہو جاتا تو زبانیں نکال نکال کر اپنی ہتھیلیاں چاٹتے ہوئے کسی اور کھیل میں مصروف ہو جاتے۔

میر نہال بچوں کی معصوم حرکتوں اور شوخیوں سے برابر محظوظ ہوا کرتے، ان شوخیوں سے جو کبھی خود ان کا سرمایۂ حیات تھیں۔ جب بھی بچے ان کو گھیر لیتے تو وہ اپنے کو یکسر فراموش کر کے ان کی باتوں کا مزا لیتے اور لطف اٹھاتے۔ لیکن ایک دفعہ وہ سچ مچ برہم ہو گئے۔ ہوا یہ کہ کبیر الدین کی بیوی کے نام ڈاک سے روپیے آئے تھے چونکہ ان کے میاں زیادہ تر دوروں پر رہا کرتے تھے وہ اپنے ساس سسر کے پاس آگئی تھیں، اور میاں پہلی کی پہلی ان کا ہاتھ خرچ بھیج دیا کرتے تھے جس وقت روپیے آئے یہ بیٹھی ہوئی سی رہی تھیں۔ روپیے لے کر انھوں نے تخت پر سوزنی کے نیچے رکھ دیے۔ بے خیالی میں ایک روپیہ پاؤں لگ کر لڑھکتا ہوا نیچے گر گیا اور انھیں سینے کی دُھن میں اٹھانے کا دھیان نہ رہا۔ اتفاق سے شاہد کی اس پر پڑی اور اس نے چپکے سے روپیہ اٹھا لیا اور حمیدا اور نسیم کو جا کر دکھایا۔ تینوں کا گٹھ جوڑ تو تھا ہی، بجائے روپیہ اماں کو واپس کرنے کے مرزا دودھ والے کے ہاں جا کر خوب برفیاں اُڑائیں۔ جو ریزگاری بچ گئی وہ ڈیوڑھی کے اندر ایک موکھے میں چھپا دی۔ دلچین کسی کام سے ڈیوڑھی میں آئی تو اس کی نگاہ پڑی۔ اس نے جا کر کبیر دلہن سے پوچھا:

"بیوی کیا آپ نے بچوں کو روپیے دیئے ہیں؟"

کبیر دلہن بولیں:

"نہیں تو۔"

پھر ان کو کچھ خیال آیا اور انھوں نے اپنے روپیے گنے تو وہی ایک روپیہ کم تھا جو لڑھک کر تخت کے نیچے گر گیا تھا۔ انھوں نے سب بچوں کو بلا کر پوچھنا گچھنا شروع کیا تینوں ایک تھے۔ کون قبولتا۔ وہ بچوں پر چیخ چلا رہی تھیں کہ میر نہال اندر آ گئے۔ بہو کو بچوں پر غصہ ہوتے دیکھ کر بولے:

"جانے دو، دلہن بچے ہیں۔"

بہو کہنے لگیں:

"ابّا میاں انھوں نے میرا ایک روپیہ اٹھا لیا اور بغیر پوچھے لے گئے۔"

بس اتنا سننا تھا کہ میر نہال آئیں تو جائیں کہاں۔ اگر انھیں کسی بات سے نفرت تھی تو جھوٹ اور چوری سے۔ ایک دم گرج کر بولے:

"دلچین لانا میری تلوار۔ ابھی سب کو بتاتا ہوں۔ نالائق، شریفوں کی اولاد اب چوریاں کرو گے، ڈاکے ڈالو گے۔ ابھی سب کے ہاتھ کاٹ ڈالتا ہوں۔"

دلچین بھی جا کر کمرے میں سے تلوار لے آئی اور اس کو دیکھتے ہی تینوں کے ڈر کے مارے پیشاب خطا ہو گئے۔ میر نہال نے کہا:

"خبردار، آئندہ کبھی ایسی کوئی حرکت نہ سنوں۔ شریفوں کے بچے اور چوری کریں!" اور وہ تلوار رکھنے کے بہانے وہاں سے چلے گئے....

مگر ایسے موقعے کم ہی آتے تھے اور بچے ہنسی خوشی چوکر۔۔۔یاں بھرتے پھرتے ہوتے یا کبھی کبھار آپس میں کوئی چھوٹی موٹی جنگ ہو جایا کرتی جو وہ خود ہی سلٹ لیا کرتے تھے۔

شام کو جب میر نہال کے دوست اور شناسا ملنے آتے تو بچوں کو بھی

بُلا کر بڑوں میں بٹھایا جاتا تھا اور ان کو ادب سے بیٹھے رہنے کی ہدایت ہوتی۔ وہ بڑوں کی باتیں سنتے رہتے تھے اور محفل میں بیٹھنے کے آداب بھی سیکھ جاتے تھے۔

غفور کمرے سے باہر بیٹھ کر حقّہ پیتا۔ وہ اب بھی اکیلا تھا، سال بھر پہلے، مہرو کی شادی کے بعد ہی اس کی بھی شادی شیخ محمد صادق کی بھانجی سے ہوگئی تھی، لیکن لڑکی کے رحم میں ناسور ہوگیا تھا اور وہ شادی کے چھ مہینہ بعد ہی جاں بحق ہوگئی۔ —— یہ انجام ظاہر تھا، وہ غفور جیسے تن و مند آدمی کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ اس کے بعد شیخ محمد صادق اس فکر میں رہے کہ پورا مہر مل جائے اور اس کے علاوہ کوئی رقم بھی اینٹھ لی جائے لیکن میر نہال نے کہا:

"یہ سب ناممکن ہے۔ آپ سے میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ لڑکی بہت کم سن ہے۔ اب میری ذمہ داری نہیں ہے۔ جو شرعاً واجب تھا وہ میں نے خود دلوا دیا۔"

غرض معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ لیکن جوان بیوی کے مرنے سے جی ٹھنڈے سے ہوگئے اور غفور میں وہ پہلا سا دم خم نہ دکھائی دیتا تھا۔ بالوں میں تیل کی لیلیاں نہ بہتیں اور وہ بجھا بجھا سا رہنے لگا......

مہرو مسرور میں لڑائی ہو کر جو تھوڑا بہت شور و غل ہو جایا کرتا تھا وہ مہرو کے چلے جانے سے ختم ہوگیا اور بیگم نہال اکثر بیٹی کی کمی محسوس کرتی تھیں۔ ورنہ اس گھر اور گھر کے مکینوں کے کاروبارِ زندگانی وہی تھے۔ چہار دیواری اسی طرح مستعدی سے حلقہ بگیر تھی جہاں تر و تازہ ہوا کا گزر ناممکن تھا۔ مگر عورتوں کی روکھی پھیکی زندگیوں کو یہ احساس بھی نہ تھا کہ ان کی حیات میں کوئی تنوع نہیں شمس و قمر، انجم و کوکب، اپنی اپنی گردشیں پوری کرتے، رُت بدلتی رہتی اور اپنے اپنے وقت پر ہر موسم نیا روپ دھار کر آجاتا۔ گرمی آتی، لو چلتی، حبس ہوتا، کڑاکے کے جاڑے پڑتے، مہاوٹوں کی اندھیری راتیں ڈراتیں، برفیلی اور نامہربان ہوائیں سنا کر

چلی جاتیں اور برسات بھی آجاتی، ابرِ سیاہ جھوم کر آتا، بادل گرجتے اولے پڑتے۔ برق کوندتی، چھاجوں پانی برس جاتا، تال تلیاں بھر جاتیں اور دریاؤں میں باڑھ آجاتی مگر ان ہستیوں کی بے حسی مدام تھی جو نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے فقیر حسبِ معمول پھیرا لگا کر گلی در گلی دردبھری صدائیں لگاتے۔ رات کے تاریک سکوت میں بلیاں غرّاتیں، لڑتیں اور پھر چھتوں پر پھرا کرتیں۔ ستارے چلے جاتے، چاند غروب ہوتا، آفتاب طلوع ہو کر آسمان کو شنگرفی کر دیتا۔ مگر زندگی بے رنگ تھی بے رنگ رہی اور غفلت سے بسر ہوتی رہی۔

جہاں آراڈیڑھ برس کی ہوگئی تھی گھٹنیاں چل کر وہ گھر کے کونے کونے کی خبر لے آتی۔ گڈ و لنے کے سہارے ایک آدھ قدم بھی اٹھالیتی۔ نیا نیا بولنا سیکھا تھا۔ اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنا مطلب بھی ادا کر دیتی۔ بلقیس کے لیے وہ ایک جیتا جاگتا ہنستا کھیلتا کھلونا تھی۔ دن بھر وہ بچی کی بھولی بھالی باتوں سے بہل کر اپنے رنجور دل کو تسکین دے لیا کرتی۔ ورنہ اصغر کو تو اب نہ بیوی کا کوئی چاؤ تھا اور نہ کوئی خیال — محبت کا وہ پہلا پہلا جوش چڑھی ندی کی طرح اتر چکا تھا اب اس کو بیوی کے جسم میں نہ تو کوئی نیا پن محسوس ہوتا نہ حسن میں سبھاؤ نظر آتا — چنانچہ وہ صبح جان بوجھ کر دیر سے سو کر اٹھتا اور بلقیس سے بالکل بے تعلق ہو کر دفتر جانے کی تیاری میں لگ جاتا گھنٹوں آئینہ میں اپنی صورت کو بن بن کر ہر زاویے سے دیکھتا، خودستائی سے مسکراتا اور پھر چھوکری کو آواز دے کر اپنے لیے چائے منگواتا۔ اکیلے اکیلے ناشتہ کرتا اور دفتر کے لیے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے جب بلقیس اسکے انتظار میں جاگتے جاگتے مایوس ہو جاتی اور اس کی آنکھوں میں تنکے سے چبھنے لگتے اور وہ تھک ہار کر

اصغر کے خیال میں سو جاتی تو گھر میں گھستا۔ داماد کی غیر موجودگی میں بیگم شہباز بیگ کم و بیش بلقیس کے پاس رہتیں اور زہرا جس کا لڑکپن اب رخصت ہو رہا تھا گھر کے کام کاج میں بہن کا ہاتھ بٹاتی اور زیادہ تر جہاں آرا کو کھلاتی۔ ماں اور بہن کے پاس ہونے سے دوسرا ہٹ تو ضرور ہو جاتی تھی مگر اصغر کی تغافل شعاریوں کا خیال آتے ہی بلقیس کے دل کی تنہائی سوا ہو جاتی۔ اور وہ ہر وقت مغموم اور خاموش رہنے لگی۔

جہاں آرا کے دانت نکلنے کا زمانہ تھا۔ اس کے مسوڑے سوج گئے تھے جس کی وجہ سے آج کل وہ ہر وقت ٹھنکتی رہتی۔ بلقیس اس کو کندھے سے لگائے پہروں ٹہلتی طرح طرح سے بہلاتی لیکن جیسے ہی مسوڑھوں میں سلسلاہٹ ہوتی وہ اور زیادہ روتی۔ اگر اتفاق سے اصغر گھر میں ہوا تو جھلا جھلا کر بیوی پر بگڑتا:

"آخر اس کو چپ کیوں نہیں کرتیں۔ بچی نہ ہوئی روگی ہو گئی۔ مستقل ریں ریں کیے جاتی ہے اور تم کو تو اب کوئی کام ہی نہیں رہا۔ ہر وقت اس کو کوٹھے پر چڑھائے رکھتی ہو۔" اور پھر وہ دانت پیس کر تلخی سے کہتا:

"آخر بیوی کا بھی کیا خاک فائدہ ہے جب آدمی کو نہ صحبت ملے نہ آرام میسر ہو۔" اور وہ پیر پٹختا ہوا جا کر دوسرے کمرے میں اطمینان سے بیٹھ جاتا۔

اگر اصغر کی خفگی دو چار روز کی ہوتی تو خیر مگر جھڑکی گھرکی، جھٹک پٹک اس کا روزانہ کا وظیفہ ہو گیا۔ وہ بلقیس سے سیدھے منہ بات کرنی بھول گیا تھا۔ میاں کے بس بھر سے جلے کٹے پر اور سکا جھڑکتے مگر وہ بظاہر خندہ پیشانی سے میاں کی نرم گرم جھیل جاتی اور بعد میں چپکے آٹھ آٹھ آنسو روتی۔

بیگم شہباز بیگ ایک جہاں دیدہ عورت تھیں۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتیں۔ داماد کے بگڑے تیور اور اپنی بیٹی سے اس کا بدلا ہوا رویہ خوب دیکھ رہی تھیں اور وہ اصغر کی طرف سے کھٹک گئیں ان کو اب جو کچھ کھٹکا تھا وہ بلقیس کا نصیبہ پھوٹ

جانے کا۔

ایک روز اصغر حسبِ معمول بیوی پر تن پھن کر کے دفتر چلا گیا تو انھوں نے بلقیس سے پوچھا:

"اے بیٹی آخر بات کیا ہے؟ تم دونوں میں کچھ ان بن ہو گئی ہے کیا؟"

"نہیں تو" بلقیس نے دبی زبان سے کہا۔ بیگم شہباز بولیں:

"بھلا بیٹی مجھ سے کیا ڈھانک رہی ہو۔ میں میاں اصغر کا رنگ دیکھ رہی ہوں سال بھر میں طور سے بے طور ہو گئے۔ کیا تم نے کچھ کہہ دیا جو وہ بات بے بات بکھر جاتا ہے۔ اور وہ ہی کیا مجھے تو بیوی تم بھی خوش نظر نہیں آتیں۔"

بلقیس کہنے لگی:

"اماں مجھے نہیں معلوم انھیں کیا ہو گیا۔ میں تو خود حیران ہوں۔ مجھ سے قسم لے لیجیے۔ میں نے تو کبھی الٹ کر ایک کہی نہ دو۔ آپی آپ روٹھے رہتے ہیں۔ ورنہ آپ نے بھی دیکھا تھا۔ ان کا مزاج ایسا نہ تھا۔"

بیگم شہباز ذرا تردّد سے بولیں:

"ہاں بیٹی جب ہی تو تم سے پوچھ رہی ہوں کہ آخر اس کو کونسی بات بری لگ گئی۔"

اس پر بلقیس کہنے لگی:

"شاید دفتر میں کام زیادہ پڑ گیا ہے اور تھکن سے وہ چڑچڑاتے ہیں۔"

"نہیں بوا۔ دنیا جہاں کے مرد کما کر لاتے ہیں۔ اے دن بھر لوٹ کر می ڈھو کر مزدور بھی جھونپڑیا میں گھستا ہے تو بال بچوں سے ہنس بول کر اپنا جی ہلکا کر لیتا ہے یہ کھوڑی کہ دھا نیو دھا نیو کرتے گھر میں گھسیں، منہ پھلائے ہوئے بیوی پر قہر اور اولاد سے بیزار۔ نوج جو کسی کا میاں ایسا ہو۔ میں نے بھی یہ سر دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ بھلا کوئی میاں بیوی میں یوں آئے دن دانتا کل کل ہوتی ہے؟ نہیں بی،
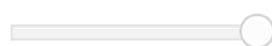
میں نہیں مانوں گی۔"

بلقیس چپ بیٹھی ہوئی جہاں آرا کو تھپکتی رہی۔ ماں جو کچھ کہہ رہی تھیں ٹھیک تھا۔ یہ حقیقت سن کر بلقیس زیادہ افسردہ ہوگئی۔ بیگم شہباز نے اپنا شبہ مٹانے کو بیٹی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور بلقیس جلدی سے گردن نیچے کر کے جہاں آرا کی پیٹھ سہلانے لگی اور وہ آنسو جو اس کے موجودہ رنج والم کا اظہار کر دیتے آنکھوں ہی آنکھوں میں پی لیے۔

بیگم شہباز۔ تھوڑی دیر خاموش کسی گہری سوچ میں غرق بیٹھی ہوئی نواسی کے لیے سہاگہ کھرل کرتی رہیں اور خاصی دیر بعد سر اٹھا کر بولیں:

"تم ابھی نادان ہو، زمانے کے اینچ پینچ نہیں سمجھتیں، تم کیا جانو ان مردوں کے رنگ ڈھنگ۔ اے میاں اصغر تو اللہ رکھے ابھی جوان ہیں۔ نگوڑی ماری مرد کی ذات تو ایسی ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکا لیں تو بھی ہرجائی پنے سے باز نہیں آتے۔ بی میرا تو دل یہی کہتا ہے کہ میاں اصغر کی نظر میں کوئی اور چڑھ گئی ہے۔ یہ بیوی سے ہر دم کا روٹھے رہنا بلا وجہ نہیں۔"

بلقیس کو گم سم پا کر انھوں نے تسلّی دی:

"گھبراؤ نہیں اللہ نے چاہا تو اس قطامہ کی طرف سے ان کا دل پھر جائے گا۔ کل ہی چنبیلی کو پیر جی کے پاس بھیجوں گی۔ ان کے تعویذ بہت مجرّب ہوتے ہیں۔"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

اب کے بہت دنوں بعد جمال بیگم ملنے آئیں۔ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اتنے میں جمال بیگم کو بلقیس کا خیال آیا اور پوچھنے لگیں:

"اے ہے بلقیس کہاں ہے۔ میرا تو جی دیکھنے کو ترس گیا۔"

بیگم شہباز کہنے لگیں: "ہوں گی کہاں، اپنے گھر میں منہ لپیٹے پڑی ہوں گی۔"

"کیوں خیر سے کیا پھر ہیر پھاڑی ہے؟"

"اے بی اللہ اللہ کرو۔ خدا نہ کرے۔ یہاں تو ایک ہی بچی کے لالے پڑے ہیں اب تم سے کیا پردہ تمہارے بھتیجے اصغر نے تو وہ پیٹ سے پاؤں نکالے ہیں کہ میں تو اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر بھر پائی۔"

یہ سن کر جمال بیگم کے کان کھڑے ہوئے اور وہ شہباز بیگم کے قریب سرکتے ہوئے کہنے لگیں:

"آخر ہوا کیا؟ بوا کچھ کہو تو سہی۔"

بیگم شہباز بڑے افسوس سے ایک سرد آہ لے کر بولیں:

"بی ہوتا کیا۔ سال بھر میں ہی اس کا دل ملقیں سے بھر گیا — اے بہن تم ہی بتاؤ بیاہ کو کے دن اور کے راتیں ہوئی ہیں۔ ابھی تو بچی کے ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی اور وہ بیوی بچی سے بیزار ہو گئے۔ نہ ہنسے نہ بولے، آپ ہی آپ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھا رہتا ہے۔ کہاں وہ شادی سے پہلے جاؤ تھے۔"

بیگم جمال نے بڑے وثوق سے کہا:

"بوا پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں۔ وہ تو ہمیشہ کا نٹ کھٹ لڑکا تھا۔ تم آج کہہ رہی ہو۔ مجھے تو پہلے سے ان کے گن معلوم تھے۔ اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن جی میں اگر زبان ہلاتی تو سب کہتے کہ بھتیجے سے جلتی ہیں۔ وہ تو سدا کا مطلب آشنا ہے۔ وہ سنا نہیں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔"

بیگم شہباز نے کہا:

"یقین جانو مجھے ان کے خناسوں کی یہ خبر ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ اللہ ماری عقل پر اس وقت کچھ ایسے پردے پڑ گئے تھے کہ نہ عیب سوجھا نہ ہنر۔

اب کیا ہوتا ہے میری بچی کی تو تقدیر پھوٹ گئی۔ اس نے اپنے کو ایسا گھونٹا ہے اور ایسی چپ لگائی ہے کہ اندر ہی اندر گھن لگ گیا۔ تم دیکھو تو پہچانو بھی نہیں کہ وہی، بلقیس ہے۔ منہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے سرسوں پھول رہی ہے۔ وہ انار کا سا رنگ ہی نہ رہا۔"

"ہاں بی وہ کہتے نہیں ہیں موزے کا گھاؤ بیوی جانے یا راؤ۔ وہ تو کہو بلقیس جیسی دبی دبائی لڑکی ہے۔ آجکل کی کسی چھلاوا سے پالا پڑتا تو میاں جی کو چودہ طبق روشن ہو کر دو دن میں سیدھے ہو جاتے۔"

بیگم شہباز کہنے لگیں:

"بس بی اب تو رات دن دعا کرتی ہوں کہ کسی طرح دونوں کے دل مل جائیں۔"

اتنے میں جمال بیگم کی ڈولی آ گئی تھی وہ گلے مل کر چلی گئیں۔

دوسروں کی ہمدردی کرنے اور غم خواریوں کا اثر یہ ہوا کہ بلقیس کو اصغر کی بے توجہی اور زیادہ محسوس ہونے لگی اور میاں کی لاپروائیاں دل کا روگ بن گئیں۔ بلقیس نے اپنی سدھ بدھ بسرا دی۔ نہ اس کا کھانے پینے کو جی چاہتا نہ پہننے اوڑھنے میں مزہ آتا۔ ماں کے کہنے کے بعد تو اب شبہ نہ رہا کہ گھر کی چھوکری سے اصغر کی چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق خالی خولی نہ تھا بلکہ بیوی سے زیادہ وہ اس ملازمہ پر ملتفت اور مہربان تھا۔ اور بلقیس ہر پہر یہ سوچتی رہا کرتی کہ آخر مجھ میں ایسی کیا کمی ہے اور وہ ایسی کونسی خطا ہے جس کی پاداش میں اصغر اس سے بے مہری کا برتاؤ کر رہا ہے۔

اور وہ اکتوبر کی انہی اداس شاموں میں سے ایک تھی جب موسم گرما الوداع کہہ کر رخصت ہو رہا تھا۔ پت جھڑ ہو کر سوکھے ہوئے پیلے پتے درختوں کے قدموں میں پڑے تھے، شاخیں عریاں ہو چکی تھیں، اور برگ و بار پر ایک ناشاد پژمردگی پھیلی ہوئی

تھی اور دل خزاں کے مایوس کن احساس سے بے کیف تھے۔

شفق پھول رہی تھی مگر آفتاب زرد تھا۔ اس کے سارے شوخ رنگ آسمان کی بے کنار وسعتوں میں بکھر گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک درد انگیز اندھیرا چار سُو چھاتا ہوا قلب کو رنجور کر رہا تھا اور جیسے کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی جدائی اور بیتے ہوئے رنگیں دنوں کی یاد فضاؤں کو بھی آ رہی تھی۔

پیڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر کوے جمع ہو کر چکر کاٹتے اور شاخوں پر بیٹھ جاتے۔ جھنڈ میں سے ایک کوا کائیں کر کے اڑتا تو سب اڑ کر منڈلاتے اور ساتھ مل کر یکساں کائیں کائیں کا شور مچاتے۔ کبوتروں کے جھلڑ تیزی سے اڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ پالتو کبوتر اپنی اپنی چھتوں پر اتر جاتے اور جنگلی کبوتر اپنے آشیانوں کی تلاش میں اُڑتے ہوئے آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔

شام کی غمگین فضا میں بلقیس تنہا و مجبور بیٹھی ہوئی تھی۔

جہاں آرا کی بھی روتے روتے آنکھ لگ گئی تھی۔ بلقیس نے اس کو پلنگ پر لٹا دیا اور پھر تنہائی سے بیزار ہو کر خود بھی اس کے برابر لیٹ گئی۔ محلّے میں سے کسی فقیر کی آواز آ رہی تھی۔ کسی کے گھر میں شادی ہوئی تھی اور فقیر دروازے پر کھڑا نئے جوڑے کو دعائیں دے رہا تھا:

"اے نصیبہ والی سہاگن دے دے اللہ کے نام پر۔ بھیج دے بابا کوئی پیسہ کوئی روٹی۔ اے آس اولاد والی تو جیے تیرا سائیں جیے۔ تیرا سہاگ قائم رہے۔"

بلقیس پہلے ہی دل شکستہ تھی، فقیر کی صدا سن کر اس کا دل اچانک کسی نامعلوم اور گہرے خوف سے ڈوب گیا۔ اس نے سوتی ہوئی جہاں آرا کو قریب کھسکا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور پھر اس کو اپنی بدقسمتی پر افسوس ہونے لگا اور اس کے ساتھ

ساتھ اپنی بچی کے حال پر ترس آگیا۔ چند مہینوں سے تو اصغر کچھ زیادہ ہی کشیدہ رہنے لگا تھا اور بلقیس اس کی بے پروائیاں دیکھ دیکھ کر بار بار یہی سوچتی رہتی کہ مجھ سے یہ بیزاری آخر کیوں ہے، یہ بے وجہ کی دل آزاری کس لیے! یہ کل ہی کی بات تھی کہ وہ ایک چاہنے والا شوہر تھا۔ مگر اب اس کی پہلی چاہت کو کیا ہوگیا تھا۔ وہ پہلی سی محبت کہاں چلی گئی تھی؟ پھر وہ شادی کے دن سے لے کر آج تک اپنی ہر حرکت پر نظر ڈالتی۔ اپنے ہر قول و فعل کا جائزہ لیتی۔ شاید بے خبری میں اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔ مگر دل کی صفائی اور اس کا بے گناہ ضمیر ہمیشہ اس کو ایک ہی جواب دیتے کہ وہ بے قصور ہے۔ اصغر اور اصغر کی رفتہ عشقیہ باتیں اور اب اس کا مکمل تغافل اس کے واسطے پہیلی بن کر رہ گئے تھے، جس کا حل وہ نہ جانتی تھی۔ اور اب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ محبت کا جو دیا اصغر کے دل میں بجھ چکا تھا اس میں اپنی محبت کی جوت پھر سے کیسے جلائے۔ وہ اس وقت بھی اپنے ان ہی خیالوں میں الجھی ہوئی بیٹھی تھی کہ اصغر کھٹ کھٹ کرتا گھر میں داخل ہوا اور سیدھا غسل خانہ میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور تیار ہونے کے بعد کمرے میں آکر اس طرح بیٹھ گیا جیسے بلقیس اور جہاں آرا وہاں موجود ہی نہ تھے۔ پھر چھوکری کو آواز دی اور اپنے واسطے چائے منگوائی۔

بلقیس اٹھی اور اپنے ہاتھ سے اس کے لیے چائے بنا کر تپائی پر رکھ دی۔ اصغر نے کوئی توجہ نہ کی اور بہت بے نیازی سے چائے کی چسکاریاں بھرتا رہا۔ بلقیس قریب بیٹھ کر ٹکر ٹکر اس کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اس وقت اس کی حالت اس سہمے ہوئے بچے کی سی تھی جو سرزنش کے بعد امید و بیم سے سزا دینے والے کو دیکھتا ہے۔ بلقیس کے دل و دماغ کی حالت تہ و بالا تھی۔ مختلف جذبات و خیالات نے اس کے اندر ہی اندر ایک عجیب خلفشار برپا کر دیا تھا۔ بیک وقت سینکڑوں خیال تھے جو

سامنے آ آ کر اس پر اپنا دباؤ ڈال رہے تھے اور پھر گڈمڈ ہو کر آپس میں برسرِ پیکار ہو جاتے۔ ادھر اس کی اپنی خودداری تھی جو اپنے مٹائے جانے پر بلقیس سے شدومد سے تقاضے کر رہی تھی کہ آج ہمت سے کام لو اور میاں سے دو ٹوک بات کر کے اس الجھن کو ختم کر دو۔ مگر دل کا مطالبہ تھا کہ قصوروار چاہے سراسر اصغر ہی کیوں نہ ہو مگر تم اپنی غلطیوں کی اس سے معافی مانگ لو۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ عقل اور دل کے دو جہانوں میں معلق تھی۔ گو پریشانیاں سوہانِ روح اور اذیت دہ تھیں مگر اصغر سے ڈرتی بھی تھی کہ اس کی اس جسارت کا انجام نہ جانے کیا ہو۔

اصغر چائے پی چکا تھا اور اٹھ کر انگنائی میں جا کر بیٹھ گیا۔ سورج کبھی کا ڈھل چکا تھا اور رات کی دیوی نے اپنے سیاہ ستاروں جڑے پر پھیلا کر ارض و سما کو ڈھک لیا تھا۔ گھروں میں چولھے جل چکے تھے۔ لکڑی کا دھواں اوپر اٹھ رہا تھا اور ہوا میں دھوئیں کی کسیلی بو آ رہی تھی جس سے کبھی تو فرحت اور انبساط دامن گیر ہوتے، کبھی غم و اندوہ دل کو پکڑتے تھے۔ جہاں آرا ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ اصغر کی نظر بیٹی پر پڑی تو محبت پدری نے جوش مارا اور اس کو بیٹی پر پیار آ گیا۔ وہ بڑھا اور جھک کر جہاں آرا کے گلوں پر چٹ چٹ پیار کرنے لگا۔ بلقیس نے یہ دیکھا اور اس کا دل امید و مسرت سے یکبارگی اچھل پڑا اور اس کے گالوں کی رگیں غیر متوقع خوشی میں دھک دھک چلنے لگیں۔ وہ چپکے سے آ کر اصغر کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور اصغر کو بیٹی کو پیار کرتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس وقت اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھے اور ان پر ایسا تبسم تھا جو اس کے دل کے زخموں کی غمازی کر رہا تھا۔ اصغر نے جب بلقیس کو اپنے قریب کھڑا دیکھا تو بچی کے پاس سے ہٹ گیا اور بڑی بیگانگی سے دیوار کے پاس جا کر دور دیکھنے لگا۔

میلوں پھیلے ہوئے مکانوں کے کوٹھے اور بالائی حصے اندھیرے میں مبہم

نثر اُر ہے تھے اور آسمان پر ستاروں کی روشنی ہو رہی تھی۔ اور ان ستاروں کو دیکھ کر اصغر کو یاد آیا کہ اس نے کبھی ان سے زیادہ روشن اور تابناک ستارے دیکھے تھے جو کبھی حسن و عشق کے پیامی بن کر اس کو قصۂ مہر و الفت سناتے تھے اور ان ستاروں کی زمردی روشنی سے کبھی اس کے دل کا جہاں جگمگا اٹھا تھا۔ مگر آج نہ ان ستاروں میں روشنی تھی اور نہ چمک۔

بلقیس ابھی تک وہیں بت بنی کھڑی تھی۔ اصغر کے اس طرح بے رخی سے اس کے پاس سے گزر جانے سے بلقیس کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک آتش فشاں تھا جس نے پھٹ کر آناً فاناً میں اس کی کل کائنات کے پرخچے اڑا دیے۔ ایک ہی دھچکے سے دل کی دنیا نے ہچکولا کھایا اور اس کی محبت کے سب محل ایک ایک کر کے نیچے آ رہے اور وہ اپنی مسمار اور تباہ شدہ دنیا کے ڈھیر پر تن تنہا ہراساں کھڑی تھی، جہاں نہ اس کا کوئی مونس تھا نہ غمخوار، کوئی ہمدرد تھا نہ مددگار۔ اتنی بے بسی سے اس کو رونا آ گیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب گئیں۔ وہ عالمِ لاشعوری میں بڑھی اور اصغر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت نہ معلوم کیسے اتنی جرأت اس میں آ گئی کہ اس نے اصغر سے کہا:

"آپ نے اب مجھ سے بات تک کرنی چھوڑ دی۔ آخر کچھ کہیے تو سہی کیوں مجھ سے خفا ہیں۔ خدارا وہ میری تقصیر تو بتا دیجیے ایسی کونسی بھول مجھ سے ہو گئی جو آپ اتنے ناخوش ہیں مجھ سے۔"

اصغر نے یہ سن کر تیوری چڑھا لی اور ترچھی چتون سے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ بلقیس کو اپنی آواز کی بازگشت کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہوئی دوبارہ سنائی دی اور اس کو اچانک معلوم ہوا کہ وہ گھپ اندھیرے میں اِدھر سے اُدھر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ اسی وقت ایک نابینا فقیر کی صدا آئی جو اس محلے میں اکثر رات کو آیا کرتا تھا۔

"آنکھیوں والے بابا آنکھیاں بڑی نعمت۔"

شام کی اس تنہائی اور سنسنائی میں فقیر کی صدا اس طرح آئی جیسے کہہ رہی ہو کہ اصغر بھی اپنی بصارت سے محروم ہو چکا اور بے بصیر ہو کر وہ راستوں کی تاریکی میں بھٹک رہا ہے۔ بلقیس اشکبار تھی مگر اصغر جس طرح بے حس کھڑا تھا ویسے ہی کھڑا رہا۔

چاروں طرف شام کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا اور ہر طرف خاموشی کا دور دورہ تھا۔ صرف بلقیس کے کانوں میں اپنی ہچکیوں کی آواز آجاتی تھی۔ آخر وہ روتے روتے بولی:

"میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی۔ بس اگر تھوڑا سا مجھ کو بھی چاہتے رہیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ رہے گی....."

گلی میں کسی لونڈے نے پٹاخہ چھوڑا اور اس کی دھمک سے بلقیس ایک دم چونک گئی اور ڈر کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں کے قطرے لڑھک کر اس کے رخسار پر ٹھہر گئے۔ بلقیس کی منتیں اور آنسوؤں سے بھرائی ہوئی آواز اصغر کو جیسے کہیں بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی اور اس کے ساتھ دھندلی یادیں جاگ اٹھیں۔ اس کے جذبات نے کروٹ لی اور لاشعور کے تہہ خانوں میں بند فراموش محبت کچھ دیر کو زندہ ہو کر نکل آئی۔ اس کا قلب پرانی یاد سے تازہ ہو گیا۔ اچانک اس کو اپنی بیوی پر رحم آنے لگا۔ اس نے قریب بیٹھ کر بلقیس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تم کو یہ فضول خیال کیوں ہوا کہ میں تم سے ناخوش ہوں۔" اس کا لہجہ اس وقت صلح کن اور غیر معمولی طور پر نرم تھا۔ "دفتر میں کام کرتے کرتے اتنا تھک جاتا ہوں کہ پھر کسی بات کو جی نہیں چاہتا۔"

بلقیس کا دل سادہ اور فطرت بھولی تھی اور اصغر سے محبت کے دو بول سن کر اس کے دل میں نہ کوئی رنج رہا نہ ملال اور اس نے اصغر کے کہے کا یقین کر لیا۔ آنکھیں
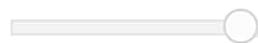
گوم تھیں اور آنسو بدستور ٹھہرے ہوئے تھے لیکن آنسوؤں کی اوٹ سے اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں اور ایک دل آویز مسرت بھرا تبسم اس کے گلابی اور بھیگے ہوئے چہرے پر پھیل گیا۔

اندھیرا چپ چاپ بڑھا اور فسوں ساز رات نے خراماں خراماں آکر اپنا جادو فضا پر کر دیا۔ اکتوبر کا حسین چاند دیوار کے پچھواڑے سے نکلا اور مسکرا کر دنیا کو جھانکنے لگا۔ اس کی نقرئی چاندنی زمین پر بکھر گئی۔ ذرّہ ذرّہ اور پتا پتا چاندی کا بنا معلوم ہوتا تھا اور ہر شے ایک لطیف اور ٹھنڈی روشنی میں نہا کر خوابناک دکھائی دیتی تھی۔ دو چمگادڑیں چاند کے مقابل اس سمت سے اس سمت اُڑ رہی تھیں اور جب وہ تیزی سے چکر لگاتیں تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنی ترنگ میں چمکتے ہوئے حسین چاند کو چھو لیں گی۔ ایک شب بیدار جھینگر کسی سوراخ میں بیٹھا ہوا بڑے مزے سے ایک ہی سُر میں جھن جھن جھنکار کی تانیں اڑا رہا تھا۔ موسمِ خزاں کی یہ رنگیلی شب مہتاب سنگم بن کر آئی تھی اور جاتی ہوئی گرمی اور آتے ہوئے جاڑے کے الگ الگ کنارے مل کر سنجوگ ہو گیا تھا، اور دلوں میں درد و گداز کی وہ پیاری پیاری خلش ہو رہی تھی جو کسی پُر سوز راگ کو سن کر ہوتی ہے اور وہ پُر کیف سکوت جو سوتی ہوئی ہر چیز کو تھپک رہا تھا اس میں جیسے کوئی بیراگی موہ اور مایا کا جال توڑ کر اس خود غرض بندوں کی نگریا سے بہت دور کسی قلّۂ کوہ پر ایک آبشار کے کنارے مست ہو کر بیٹھا ہوا رباب بجا رہا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

عشق کے کھیل جگ سے نیارے ہیں۔ پریم اگنی آپ ہی جلائے آپ ہی بجھائے۔ جو آتشکدۂ عشق میں آیا جل کر نیست و نابود ہو گیا۔ اور کبھی پریم کی حدت سے قلب بقعۂ نور بن کر خزانوں سے مالا مال ہو گیا۔ عشق کبھی نور ہے کبھی ظلمت، خود

ہی معنی ہے خود ہی صورت اور جب ایک بار آتشِ شوق دھیمی پڑ جائے اور گرمیٔ عشق فنا ہو جائے تو اس کو دوبارہ دلوں میں روشن کرنا مشکل ہے۔ محبت وہ ساز ہے جس کے نازک اور حساس تار ایک دفعہ ٹوٹ جائیں تو پھر ان میں سے کوئی نغمہ نہیں ابھرتا۔ جہاں عشق بے ساختہ اور سرکش ہے وہاں جذبات اور ولولے بھی آزاد۔ عشق کی نیرنگیاں اپنی جلو میں طغیانیاں لے کر آتی ہیں اور طغیانیاں لے کر چلی جاتی ہیں مگر عشق و محبت کی پیہم شورشیں اور جذبات کی پے درپے یورش انسان کے دل کو سخت اور سنگین بنا دیتے ہیں۔ مسلسل مقابلوں سے وہ بے حس ہو جاتا ہے۔ اور اصغر کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے من مندر کے کواڑ بند ہو چکے تھے۔ پریم اگنی بجھ چکی تھی، اور محبت کی دیوی اس کے دل میں سو چکی تھی۔ اس روز شام کو بیوی سے ملاپ ہونے سے صرف یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کو ختم ہوتی ہوئی محبت کی دبی چنگاریاں لو دینے لگیں اور وہ بظاہر پھر سے محبت کرنے لگا اور کچھ دنوں تک وہ پہلی سی رونق گھر میں رہی۔ بلقیس دوبارہ محبت پا کر از حد خوش تھی۔ مگر یہ سب ایسا ہی تھا جیسے کوئی مرنیوالا جاتے جاتے آخری سنبھالا لے لے۔ وہ باتیں جو اوپری ہوں اور جب دل کا تعلق باقی نہ رہے تو کہاں تک نبھ سکتی ہے۔ آخر کار وہ محبت اور جذبات ہمیشہ ہمیشہ کو مر گئے۔

اب بیگم شہباز بھی اصغر سے شاکی ہو گئیں۔ جب بھی انھیں خیال آتا ایک چوٹ سی دل پر لگتی کہ گئے برس تک ان کا داماد کس سعادت مندی سے ان کی تابعداری کرتا تھا۔ چھینک بھی آجاتی تو پٹی پکڑ کر بیٹھ جاتا، دوڑا دوڑا جا کر حکیم صاحب سے نسخے بندھوا لاتا اور ان کی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتا۔ اسی وجہ سے اب ساس اور زیادہ تلملانے لگیں کہ وہ ان کو بھی گھاس نہ ڈالتا تھا۔ اب تو جانے کسی نے کیا ڈھائی اچھر پڑھ کر اصغر پر پھونک دیا تھا کہ اس نے ان کے پاس بھی سرے سے آنا چھوڑ دیا اور اگر کبھی بھول چوک سے آیا بھی تو سرسری اور اکھڑی اکھڑی

باتیں کیں اور سوا ہو گیا۔

اصغر کی باتیں وہ تھیں جو نہ دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ بلقیس اگر سہہ رہی تھی تو اس کا فرض تھا۔ وہ بیوی تھی۔ مگر بیگم شہباز کا ہے کو داماد کی گستاخیاں برداشت کر کے للّو پتّو کرتیں۔ ان کی تنگ مزاجی اس بات کی کب متحمل ہو سکتی تھی۔ پھر ان کا رشتہ بڑا انھا۔ وہ آخر کو ساس تھیں۔

بلقیس جو کام کر کے رکھتی اصغر ڈھونڈھ ڈھونڈ کر عیب نکالتا جھینکنا پیٹتا۔ ایک دن بیگم شہباز وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر تک تو اس کا طنطنہ دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں:

"اے میاں اصغر ہوش کی لو۔ آخر تیسوں دن اس طرح ہائے توائی کوئی بھلے مانسوں کا شیوہ ہے۔ آخر آدمی کہاں تک صبر کر سکتا ہے۔ اب کیا، مہینوں سے تمہارا ایسی چلن دیکھ رہی ہوں۔ بیوی بچی جیسے تم کو زہر لگتے ہیں۔ آخر تمہاری منشا کیا ہے؟"

اصغر نے ترش رو ہو کر کہا:

"ذرا فرمایئے تو میرا کونسا چلن دیکھ رہی ہیں؟"

"بس میاں بس منہ نہ کھلواؤ۔ اب تو اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات کی کسر رہ گئی ہے۔"

اصغر بگڑ کر بولا:

"خوب صاحب خوب۔ میرا نہیں دیکھتیں کہ میں بھی آخر آدمی ہوں۔ گھن چکّر تو نہیں ہوں۔ مجھے بھی آرام اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح جُتا رہتا ہوں اور گھر میں آ کر دو گھڑی کا چین بھی نصیب نہ ہو، نہ میری کوئی چیز جگہ پر ملے۔ پھر شادی کا کیا فائدہ؟"

بیگم شہباز نے بھی تڑاق سے کہا:

"اے تو کسی پر کیا احسان ہے۔ کونسا مردوا بغیر ہاتھ پیر ہلائے بیٹھا رہتا ہے۔ دنیا جہان کے مرد اپنے بال بچّوں کے سکھ چین کے لیے کرتے ہیں۔ تم نے کیا کمال دکھایا۔ کوئی عرش کے تارے توڑ کر لا دیتے ہو؟"

"خیر چھوڑیے۔ میں تو کچھ نہیں کرتا۔ مجھے میرے حال پر تنہا چھوڑ دیجیے۔"

"لو یہ بھی نرالی کہی۔ اوئی ایسے ہی اکیلے چھڑے رہنے کا شوق تھا تو تم نے شادی ہی کیوں کی۔ کس نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ اب تو لور کے لڈّو کھالیے۔ تمہاری ذمہ داری ہے۔ سن لو میں نے بھی اپنی بیٹی کوّے ہنکنی بنا کر تمہارے گھر کی چوکسی کرنے کو نہیں دی تھی۔ آخر میاں کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں۔"

"تو آپ ہی فرما دیجیے نا، میں اپنے فرائض کس طرح انجام دوں جو آپ کو نظر آئیں۔ باہر کا سنبھالوں، کمانے کی فکر کروں یا گھر میں آپ کی بیٹی کی ناز برداری کرتا رہوں۔" اصغر نے اونچی آواز سے جواب دیا۔

بیگم شہباز جو کچھ کہہ رہی تھیں یہ باتیں چاہے ترش سہی مگر تھیں پتے کی اور اسی وجہ سے اصغر زیادہ بُرا مانتا رہا۔

"بس رہنے دو۔ مجھے دیدے نہ دکھاؤ۔ میں کسی خوشی خاں سے نہیں ڈرتی۔ یہ گیدڑ بھبکیاں تو کسی اور کو دکھانا۔ اے میں نے تمہیں کیا کہا ہے جو آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہو۔ سب پہلے ہی سوچ لیا ہوتا۔ کیوں پرائی جانوں کا روگ پالا۔ میں تم کو ہرگز ایسا نہیں سمجھتی تھی بس کماؤ، گھر میں بیٹھ جاؤ۔ بیوی کو کسی کے گھر کی ماماگیری کرنے بھیج دینا۔"

اصغر بھی چلّا کر بولا:

"اپنی بیٹی سے پوچھ لیجیے کب انہیں تنگی ترشی ہوئی ہے یا میں نے کبھی ہاتھ

Scanned by CamScanner

روکا ہے۔ ملکہ اپنی بساط سے زیادہ ہی کیا۔ جب ہی تو یہ صلہ مل رہا ہے۔"

"تو کون کہتا ہے کہ لنگوٹی میں پھاگ کھیلو۔ بیوی خالی خولی روٹی کپڑے کی بھوکی نہیں ہوتی۔ آخر پیار محبت کا سلوک اور دو میٹھے بول بھی کوئی چیز ہے۔"

"معاف کیجیے میں نے یہ سب شرائط نکاح نامے میں نہیں لکھے تھے جب مجھ میں یہ اُپج ہی نہیں تو کہاں سے لاؤں۔ اور جب آپ بیٹی دے رہی تھیں آپ کو معلوم تھا میں کیسا آدمی ہوں۔ آپ کے بھی آنکھیں تھیں دیکھ لیا ہوتا۔ اب مجھ سے کیا شکایت ہے۔"

بیگم شہباز تو یہ کہہ کر اپنے گھر آ گئیں کہ "سلام ہے تمہاری زبان کو" اور اصغر بلقیس پر برس پڑا:

"مجھے بھی تو بتاؤ تم کو کب میں نے فاقوں مارا ہے۔"

"مگر کون کہتا ہے؟" بلقیس نے دھیرے سے کہا۔

"تمہاری اماں جان اور کون! کیا تم نہیں سُن رہی تھیں؟"

"مجھ سے کسی چیز کی قسم لے لیجیے جو کبھی اماں سے ایک لفظ بھی آپ کے خلاف کہا ہو۔ آپ میری بات کا یقین کیجیے۔"

"بالفرض تم کو مجھ سے کوئی شکایت تھی بھی تو مجھ سے کہتیں۔"

"مگر میں نے اماں سے نہیں کہا۔" اور وہ رونے لگی۔

اصغر منہ چڑانے کے انداز میں بولا:

"یہ عجب تماشا ہے کہ ساس ٹانگ لیں کہ بیٹی پر فاقے ٹوٹ رہے ہیں اور بیٹی سے پوچھو تو بڑی ننھی نادان بن کر کہیں مجھے نہیں معلوم۔ ماں بیٹیوں نے مل کر میری زندگی وبال کر دی۔ پھٹکار ایسی زندگی پر۔ بہتر ہے چار کوڑی کا زہر کھا کر سو رہوں۔ اس عذاب سے نجات ہو جاؤں گا۔"

اصغر طیش میں انا پ شناپ بکنے چلا گیا اور بلقیس کو روتا دیکھ کر جل کے بولا:
"ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں۔"
اتنا سنتے ہی بلقیس جیسے بہری بیٹ ہو گئی اور اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا
اس ایک آن میں یہ معلوم ہوا کہ اچانک وہ آئینہ اس کے ہاتھ سے تڑخ سے چھوٹ
گیا جس میں وہ اپنی شکل دیکھ رہی تھی۔ ایک چھناکے کے ساتھ بکھر کر بیچ میں اس کی
صورت ریزہ ریزہ ہو کر فرش پر بکھر گئی۔ ٹوٹے آبگینے کہیں جڑے ہیں۔
شب کی سیاہی میں اس کی ہچکیاں ابھرتی ڈوبتی رہیں مگر اصغر پرسانِ
حال نہ ہوا۔ اور جس طرح ایک نابینا کے لیے دن کا اجالا اور رات کی سیاہی کوئی معنی
نہیں رکھتے، بلقیس کے نزدیک بھی اپنی موت و زیست کا مفہوم باقی نہ رہا۔ اور
ساس سے دوبدو لڑائی ہو جانے کے بعد اصغر کا رہا سہا لحاظ بھی ٹوٹ گیا اور
جیسے اسے پروانۂ آزادی مل گیا ہو، وہ بے فکر ہو کر گھر سے غائب رہنے لگا۔

۸

پھر ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ بستی بستی سے جوان بھرتی کیے جانے لگے اور دلّی کی سڑکوں پر رنگروٹ قواعد کرتے ہوئے دکھائی دیتے اور گلی کوچے ان کے رزمیہ ترانوں سے بجتے رہتے:

بھرتی ہو جا نا رے باہر کھڑے رنگروٹ
یہاں چلائے لاٹھی سونٹھا وہاں چلے بندوک

جو خود مفتوح ہو چکے تھے اب اپنے فاتحین کے لیے رزم آرا ہو گئے تھے۔ اور یہ دھرتی کے وہ کڑیل سپوت اور بیش بہا لال تھے جو محض بارہ روپے کی تنخواہوں کے عوض ایندھن بن کر لڑائی کے جہنم میں جھونکے جا رہے تھے۔

گاؤں کے آئے ہوئے یہ لمبے تڑنگے تندرست جاٹ، میوا اور رانگڑ جوان جواب فوجی وردیوں میں کسے کسائے رہتے تھے چاندنی چوک کی سجی سجائی دوکانوں پر ان کے جمگھٹے نظر آتے بھونچکا ہو ہو کر وہ دوکانوں کی چیزوں کو دیکھتے۔ حیرت و استعجاب سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں

میں رہنے والوں نے بھلا کب یہ رنگ و حسن دیکھا تھا۔ شہر کی ہر بات ان کے لیے نئی تھی اور دلکش۔ اور وہ تمام دن بازار میں کھوئے کھوئے ایلے گیلے پھرتے۔ وسیع و فراخ دلّی ان کے واسطے بھول بھلیاں کا شہر ہو گئی تھی۔

یوں تو مرزا دودھ والے کی دوکان ہمیشہ سے گپ شپ کا اڈہ تھی اور بیکار وقت گزارنے کا ٹھیّا، مگر اب تو اس کی حیثیت اچھی خاصی چوپال کی سی ہو گئی تھی۔ جنگ کی گرما گرمی ہوتے ہی دوکان رات کو دیر تک کھلی رہنے لگی جہاں کلّن کبابی صدیق بنیا اور خلیفہ جی تو ہوتے ہی تھے مگر محلّے کے اور لوگ بھی جمع ہو کر سیاست بگھارتے اور اپنی اپنی عقل و خرد کے مطابق جنگ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے اور اپنے علم کے موافق جنگی خبروں پر تنقید و تبصرے ہوتے، معاشی بحران اور لڑائی کے سو دوڑیاں پر گفتگو ہوتی، تخریبی مشینوں، مہلک بموں اور نئی نئی ایجادوں کی سنسنی خیز خبریں بڑے وثوق سے سنائی جاتیں۔ کلّن کبابی حقّہ اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہتا؛

"دئی مرزا پیارے ہماری عقل تو گھن چکّر بن گئی۔ بڑوں سے کہانیوں میں جو سنتے تھے جیتی زندگی ان آنکھوں سے دیکھ لیا۔ قربان ان انگریزوں پر، جادو کر دکھایا۔ سنا تم نے بھئی واللہ ایسی مشین بنائی ہے کہ وِس کے اندر ہزار دو ہزار آدمی ایسے گھس جائیں جیسے مرغی کے پیٹ میں انڈا، وئی مشین ہے یا عمر عیّار کی زنبیل۔ اور سن لو۔ دشمنوں کے بیچوں بیچ اس طریوں سر سرائی جاتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور پھر کھٹ دِنا سے ہزار آدمی بندوقیں تانے دے باہرے کھڑے وے ہیں۔"

اور بیٹھنے والوں میں سے کوئی اپنے ذہنِ رسا کا اظہار کرتا:

"یارو دِن کی تو پتلونیں ڈھیلی ہو جاتی ہوں گی۔"

خلیفہ کہتا: "ابے جرمن تو انگریز کا بھی باپ نکلا۔ دئی وِس نے تو انگریز
کو لُنگی کا ناچ نچا دیا۔ ایسے چرکھے داؤں مارتا ہے کہ خدا کی قسم وِن کا توڑ ہی نہیں۔
سپاہیوں کی ڈاڑھیاں بڑھ جاتی ہیں، پیارے خندقوں میں بیٹھے بیٹھے اور وِن میں
پھر شروع ہوتی ہے کھاج، اور بندر کی طریوں نوچتے ہیں تو جرمن کیا کرتا ہے کہ
خود ہی پیچھے ہٹ جاتا ہے میدان چھوڑ کے جیسے پِدّا پہلوان ہٹ جاتا تھا،
بس وِسی طریوں۔ اور یہ انگریز بھیّا بدھو پیر مزے میں آن آگے کو بڑھتے چلے جاتے
ہیں اور وِن کے ٹھکانوں پر جو پہنچتے ہیں تو وِنہیں استرے مل جاتے ہیں، پیارے
یہ تو ہیں ہی دن کے اندھے سب بھول بھال اپنی کھجلی مٹانے استرے لے کے بیٹھ
جاتے ہیں مونڈنے کو۔ یہ باشایہ استرے زہر کے بجھے ہوتے ہیں۔ بس سمجھ لو ادھر
تو مُنڈے کے کیسر وسا نکلا دِھر ملک الموت نے ٹینٹوا دبایا ہیں۔ ہزاروں لیٹے کے
لیٹے رہ گئے۔ اب پڑے ودے ہیں بلبے بلبے۔"
تبرّھی بھی حقّہ کا کش بھرتا اور اس سے بھی زیادہ نئی اور پھڑکتی ہوئی تازہ
بتازہ خبر سناتا:
"وئی پیارے تم نے ابھی سنا ہی کیا ہے۔ کچّھ وِس جرمن والے نے تو شیطان
کے بھی کان کتر دیے۔ وِنہوں نے ایک مرغا بھی بنایا ہے کاٹ کا ککڑوں کوں کرتا ہوا
وئی پتا نہیں چلتا بالکل اصل۔ وئی یہ تو مر رہے ہیں نافاقوں خندقوں میں پڑے
چنے چبا رہے ہیں۔ وہ اپنا مرغا وِنکی طرف چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بھوکے بنگالی جو مرغا آتا
دیکھتے ہیں۔ کنگلوں کی طریوں وِس پر پل پڑتے ہیں۔ وئی ہاتھ لگایا اور پیٹ دِناوہ
بولا ککڑوں کوں اور منہ میں سے گولیاں چلنی شروع ہوئیں دنادن۔ اور پیارے
ایک طرف سے نہیں مارتا وہ پیچھے سے بھی چھوڑتا ہے زہریلی۔ کچھ ادھر اگاڑی سے
مرے کچھ پچھاڑی سے لیٹے کے لیٹے رہ جاؤ۔ میری جان کھاؤ مرغا پیارو۔ وئی

کیا عقل پائی ہے وِسنے۔ اُماں داستانِ امیر حمزہ کے کرشمے نظر آتے ہیں۔"

اور اس خبر پر کوئی رائے زنی کرتا:

"وہاں کیا شان ہے وِس پاک پروردگار کی۔ اب آئیں گے بچّہ جی کو مزے، یوں جانو فرعون کو موسیٰ مل گیا۔"

کبابی کہنے لگا:

" ابے حریان کیا ہو رہا ہے؟ تو نے مرغی والی بھی سُنی؟ پیارے انڈے بھی بن بیے ہیں وِنہوں نے۔ اپنے کمپ میں چھوڑ جاتے ہیں پڑے وے اِدھر ودھر۔ یار لوگ سمجھتے ہیں اللہ میاں نے مرغیاں وِن پر رحم کھا کر نازل کر دی ہیں جنگل میں انڈے دینے کو وِن کے لیے۔ ضیافت اتر رہی ہے وِنہوں کے لیے آسمان سے، یہ پتا ہی نہیں کہ ملک الموت کا انڈا ہے وِدھر دانت لگایا نہیں کہ پٹاخہ چھوٹا۔ مُنڈیا غائب دھڑ ہی دھڑ رہ گیا۔ اب ہلے جاؤ۔"

اتنے میں ایک گاہک آگیا اور مرزا دودھ والا اٹھی پھرتی سے دودھ کو ایک لٹیا میں سے دوسری میں اچھال اچھال کر ٹھنڈا کرنے لگا۔ دودھ کا ایک تار بندھ جاتا اور جب اوپر کی لٹیا میں سے دھار نیچے کی لٹیا میں گرتی تو دودھ کی ہلکی ہلکی شرشر کی آواز نکلتی اور اس میں جھاگ اٹھنے لگتے۔ کبابی کا فقرہ سن کر اس سے نہ رہا گیا اور کہنے لگا:

"وِن کا رعاب شحاب یا رخاں پر تو پڑتا نہیں۔ پیارے الّو بنا دیے ہیں ہریالی دکھا دیتے ہیں ہریالی۔ خدا قسم چاروں طرف موت برستی ہے۔ ہمارے جوانوں کو اپنی لُگائیوں کا لالچ دے دے کر لے جاتے ہیں اور کوئی میم ٹکے کو نہیں پوچھتی۔ لندن میں تھوڑی ہی رو کتے ہیں۔ سیدھے لے جاتے ہیں موت کی کوٹھڑی میں جہاں آگ برس رہی ہے دن کو بھی رات کو بھی۔ وہاں وہ پیار کرتی ہے، بھینچ بھینچ کے گلے

لگاتی ہے۔ یہ باولے بودم وہاں جاجا کے جان بے فضول دیتے ہیں کوری بارکاری کے لیے۔ خدا قسم اللہ میاں کے ہاں بھی دوزخ ملے گی۔ جاؤ سالو میموں کے لالچ میں۔ نہ میم ہی ملے گی نہ حور ہاتھ آئے۔ یہاں بھی جلتے رہنا وہاں بھی دوزخ میں۔ مُل میں کہتا ہوں ہم سے بڑا گدھا بھی کوئی نہیں اور انگریز سے زیادہ ہشیار بھی کوئی نہیں۔ جیسے گدھے والا دور سے گدھے کو گاجر دکھاتا رہتا ہے۔ وہی طریوں یہ بھی لاسے پرے جا رہے ہیں، گاجر نہیں ملتی بوجھا ڈھوئے جاؤ پیارے۔"

یہ کہہ کر مرزا رُکا اور دودھ مٹی کے آبخورے میں ڈال کر کڑھاؤ کے کنارے سے بالائی کا موٹا سا ٹکڑا کھپچے سے کاٹ کر دودھ میں ڈال دیا اور اوپر سے بھا چھڑک کر گاہک کی سمت بڑھا دیا۔ گاہک دوکان پر ہی کھڑے کھڑے پھونک مار مار کر دودھ ٹھنڈا کر کے پینے لگا اور مرزا اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا:

"وئی کھری کھری تو یہ ہے کہ یہ انگریزوں کی ساری چکنی چپڑی باتیں ہیں۔ وہاں نہ عورت ملتی ہے نہ دھن دولت۔ فقط جہاز میں ایک دفعہ بیٹھنے کی دیر ہے کہ بیٹا چوہے دان کا منہ بند۔ پھر سمندر پار لے جا کر قربانی کے بکروں کے طریوں قصائی کے حوالے کر دیتا ہے۔ بوٹیاں کی بوٹیاں کھا جائے اور ہڈیوں تلک کا شوروا پی جائے۔ نہ ہڈی ملے نہ بوٹی۔ کبھی قبر بھی نہ بنے پیارے کہ آل اولاد کبھی فاتحہ ہی پڑھ لے۔ رانڈ بیٹھی روتی رہے۔ مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔"

جذبات کی شدت سے اس کی آواز اونچی ہو گئی جس میں فکر و اندیشہ اور تاسف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ ذرا کی ذرا رُکا اور پھر بولا:

"بڑا دربار رچایا تھا۔ قسم ہے وِس مولا کی ایسی منحوس گھڑی کبھی آئی ہی نہ ہوگی۔ اس دن سے جو مہنگائی بڑھنی شروع ہوئی تو آج تورڑی ہی بڑھتی ہی جارئی ہے۔ نہ چینی ملے نہ گیہوں۔ چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کرے گا۔ چھپّنیا کال میں بھی ایسا حال

نہیں دیکھا۔ پیارے اجاڑ کی بِدّیا ہے اجاڑ کی۔ اندھیر ہے گھی تو لوں ماشوں بکنے لگا اور بلیا ڈنڈی مارتا ہے سو نفع میں پیسے دھڑی کی چیز اشرفیوں کے مول ہو گئی۔"

دکان میں بیٹھے ہوئے لوگ خاموشی سے مرزا کی باتیں سن رہے تھے۔ کوئی حقہ کا دم کھینچتا تو گڑگڑ کی آواز آتی۔ ایک بلّی دوکان کے پٹڑے کے نیچے بیٹھی ہوئی کبھی کبھی باریک سی میاؤں کرتی اور چراغ کی پیلی روشنی میں اس کی ہری آنکھیں چمک جاتیں۔ مرزا نے سانس لے کر کہا:

"گیہوں تو آٹھ سیر کا تم سب ہی کھا رہے ہو میں کیا کہوں۔ یہ اپنے یاروں کے لیے بھر بھر کے لیے جاتے ہیں جہازوں پر جہاز ہمارا پیٹ کاٹ کے۔ قربان پاک پروردگار کے جنم نہ دیکھا بوریا اور سپنے آئی کھاٹ۔ اب ہمارے ان داتا بنے بیٹھے ہیں۔ مگر جیسے کو تیسا۔ ان حرمن جنوائی نے بھی وہ گولا تاک کے مارا کہ جہاز سمندر کی پاتال میں:
نہ تو کو نہ موکو، لے چولے میں جھونکو" پھر اس نے سرسری نظر ڈال کر کہا:

"یارو، تم ہی ایمان سے کہو جو میں کہ رہا ہوں کیا جھوٹ ہے؟"

اس وقت مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں باہر کو ابھر آئی تھیں اور اس کی سفید جگّی ڈاڑھی کے بال مدھم روشنی میں چمک رہے تھے اور ڈاڑھی کی نوک خنجر کی طرح نوکیلی نظر آ رہی تھی۔

کلّن بڑھئی کے ہاتھ میں حقے کی نے اس کے منہ میں لگی ہوئی تھی۔ خریدار بھی مرزا کی باتوں میں اتنا محو تھا کہ اپنا دودھ ابھی تک ختم نہ کیا تھا۔ اس کا آخری جملہ سن کر سب نے ہم زبان ہو کر مرزا کی تائید کی۔

"وئی خدا کی قسم بات تو پیارے سولہ آنے نقد کہی۔"

کبابی غصے سے کہنے لگا:

"قسم ہے سولہ آنے کی یہ فرنگی حرام کے نطفے شیطان کی اولاد کیا کیا باتیں

بنائی تھیں، اور ہم بھولے بھالے دِن کے بہکاوے میں آ گئے"
اس پر کلن بڑھئی نے افسوس نے کہا:

"اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ سر پکڑ کے روؤ"

صدیق بنیا بھی دوران گفتگو میں دوکان کی طرف آ نکلا تھا اور لکڑی کے پٹرے سے لگا ہوا جس پر سب بیٹھے ہوئے تھے مرزا کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ موٹا تازہ تھا اور بیچ رنگی تہبند اس کے گول مٹول کولھوں پر طبلے کے غلاف کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ اس کی مٹکا سی توند کی نوک نمایاں طور پر ابھری ہوئی تھی اور گال مٹاپے کی وجہ سے اتنے پھول گئے تھے کہ آنکھیں چھوٹی ہو کر درز کی طرح دکھائی دیتی تھیں کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتیں چڑھ جانے سے اس کے پو بارہ ہو گئے تھے۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر گندم کی کھتیاں بھر لی تھیں اور اب دوگنے چوگنے فروخت کر رہا تھا۔ گھی بھی چوری چھپے بغیر چنگی اور محصول کے منگوایا کرتا اور ہر چیز پر اصل سے کہیں زیادہ منافع کماتا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ انگریزوں کی طرف داریاں کرتا اور ان کے راج کو سراہتا۔ جب سب خاموش ہو گئے تو اپنی توند پر آسودگی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا:

"بات تو آپ کی نغد ہے مل اتنا میں بھی کہوں گا کہ اپنے ہی باشا کے برخلاف اس طریوں سر اٹھانا اچھا نہیں"

مرزا اس جملے کو سنتے ہی بھڑک اٹھا اور کہنے لگا:

"بڑا حماتی بن کر آیا ہے کہیں سے۔ یہ کافر ہوگا تیرا باشا تیرے باپ دادا کا باشا ہمارا باشا ہمارے رب کے سوا اور کوئی نہیں"

صدیق بھی ذرا تن کر بولا:

"قسم ہے اڑان چھلّے کی تو اور جو کچھ کہے ہم مان لیں گے مُل باشا باشا ہوتا ہے

اور اللہ نے کنگ جارج کو ہمارا باشّا بنایا ہے اور تم اللہ کے بنائے وے باشالی ذلت کرتے ہو تو کسی طریوں روا نہیں جب پتیلی ہیں کھاتے ہو وسی کے پیندے میں چھید کرتے تمہیں شرم نہیں آتی؟....."

دوکان میں لٹکی ہوئی مٹی کے تیل کی کپّی کی بتّی کا گل جل جل کر جھڑ رہا تھا اور اس کی لہراتی ہوئی سرخی مائل زرد روشنی صدیق کے چہرے پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھی کہ وہ کسی سوانگ کا بیچا معلوم ہوتا تھا۔ مرزا نے بدمزگی سے ٹکڑا توڑ کر جواب دیا:

"ہم اپنے مولا کا دیا کھاتے ہیں۔ اللہ نے اپنے کلام پاک میں رسول کو ہمارا بادشا بنایا ہے۔ ہمارا اور کوئی باشّا واشّا نہیں۔"

خریدار پورا دودھ پی چکا تھا اور اس نے آبخورہ دوکان کے سامنے پھینک دیا۔ تڑ سے ایک تڑاخا فضا میں لرزا اور آبخورے کے ٹوٹے ہوئے ٹھیکرے زمین پر بکھر گئے۔ تختے کے نیچے سے ایک بلّی نکل آئی اور چھوٹے ٹکڑوں کو چاٹنے لگی۔

"اور تو بڑا رستم کا سالا نکل کے آیا ہے۔ اس وخت بڑا یار غار بن کر نمک حلالی دکھا رہا ہے۔ بچو جب دھر لیں گے تو میا کو پکاروگے۔ وِس وخت یاد کریجو کہ مرزا دودھ والا کہتا تھا....."

بات بڑھتے دیکھ کر کالن بولا:

"ابے او صدیق! تانا شاہ کے سالے، پھر کسی دن یہ سبق پڑھا یو۔ ہمی نان۔"

یہ سن کر سب زور سے ہنس دیے۔ اور صدیق اپنا سا منہ لے کر رہ گیا، اور وہاں سے چلتا بنا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ کپّی کی لو اِدھر سے اُدھر لہرائی، بل کھایا اور بھڑک کر بجھ گئی پھر گلی میں مکمل اندھیرا ہو گیا۔

۹

ایک روز میر نہال نواب چھتن کے ہاں سے گھر واپس آرہے تھے۔ شام ہونیوالی تھی۔ بازار ہمیشہ کی طرح بارونق تھے۔ لوگ حسبِ معمول خرید و فروخت میں مصروف تھے اور سڑکوں پر تانگوں، بگھیوں اور اکوں کا شور تھا۔ ٹریم گاڑیاں آتیں، ٹھہرتیں اور چلی جاتیں۔ بہیتوں کی گھڑگھڑ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی ٹکاٹک کے ساتھ کوچوانوں اور سائیسوں کی آوازیں ابھرتیں اور خونچے والوں کی مختلف صداؤں میں مل کر کھو جاتیں، اور فضا میں ایک مسلسل بھنبھناہٹ سنائی دیتی۔ مگر میر نہال زندگی کی بھاگ دوڑ سے بے پروا بھیڑ بھاڑ سے بچتے بچاتے پٹری پٹری چلے جارہے تھے۔

چلتے چلتے انھوں نے یوں ہی گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر اس وقت گنتی کے کبوتر اڑ رہے تھے۔ ان کو یہ تبدیلی اچانک محسوس ہوئی اور خاصا تعجب ہوا جنگ کی وجہ سے یوں تو بظاہر دلّی کے حالات میں کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا، مگر اناج کے بھاؤ چڑھ گئے تھے جس کی لپیٹ میں کم حیثیت والے لوگ آ گئے اور بہاشما اور غریب طبقہ لازماً متاثر ہوا۔ ان میں نائی، دھوبی، قصائی، سقے سے لے کر

ہر قسم کی چھوٹی بڑی صنعت و حرفت کے دستکار، جیسے زردوز، گوٹے ٹھپّے اور کرن بنانے والے، چھیپی اور دیگیتے ٹھٹھیرے، ساد ے کار اور قلعی گر، ریشمی اور بنارسی کپڑا بُننے والے جلاہے، منہیار اور تار کش غرض ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ ہر چیز کی کساد بازاری بڑھ رہی تھی، اور روزمرہ استعمال ہونے والی معمولی معمولی چیزوں کے دام آگ مول ہو گئے۔ اس کے برعکس محنت کش لوگوں کی پونجیاں گھٹتی جا رہی تھیں اور وہ قلاش ہو گئے تھے۔ انگلستان اور جرمنی سے مشینوں کا بنا ہوا مال بازار میں ارزاں نرخ پر بکنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان پیشہ وروں کے روزگار مندے ہو گئے اور اب جبکہ انھیں اپنے ہی جان و تن کی پڑ گئی تھی تو بھلا شوق کیوں کر قایم رکھتے۔ یہ ان کی بساط سے باہر تھا کہ جانور پال کر انھیں اتنا مہنگا اناج کھلائیں۔ مجبوراً انھوں نے کبوتر پالنے چھوڑ دیے۔

دراصل یہ شوق ان ہی کارخانے داروں کا تھا۔ یہی وہ دلّی کے دل والے تھے جن کے منہ چکنے اور پیٹ خالی تھے اور ان ہی کے دموں سے غدر کے بعد بھی دلّی کا بچا کھچا، لٹا پٹا حسن کچھ نہ کچھ باقی تھا اور دلّی کی پرانی شوخیاں کچھ برقرار تھیں۔ لہٰذا ان کے وجود غنیمت تھے جن کی زندہ دلی سے وہ جولانیاں اور دلّی کے اوصاف وابستہ تھے۔ لیکن اب زمانہ کی کروٹ کے ساتھ یہ تمام رنگ رائیاں دم بدم مٹتی جا رہی تھیں، شوق اور ذوق فنا ہوتے جاتے تھے۔ البتہ کچھ کھاتے پیتے آسودہ حال لوگ باقی تھے جو باوجود مہنگائی کے اپنے شوقوں کو پورا کر سکتے تھے اور انھوں نے اپنی کبوتر بازی برقرار رکھی۔ لیکن یہ لوگ اتنے ہی تھے جتنا آٹے میں نمک۔ اور میر نہال کو اس وقت چند کبوتر دیکھ کر حالات کے اس طرح بدل جانے کا تلخ احساس ہوا اور وہ اپنے دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے راستہ طے کرتے رہے۔

چلتے چلتے اچانک ان کو ایک گھمیری آئی اور غشی کی سی حالت ہوگئی۔ وہ فوراً رُکے اور جلدی سے ایک دیوار پکڑ کر سہارا لیا۔ گہرے اور لمبے سانس لے کر انھوں نے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ خاصی دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑے رہے اور جب سر کے چکّر ذرا کم ہوئے اور آنکھوں کا اندھیرا دور ہوا تو آنکھیں کھول کر جھپکائیں۔ گو اندھیرا تو کم ہو چکا تھا مگر آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے اور سر بھاری تھا۔ جب وہ چلنے کو بڑھے تو قریب کی موری میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو نالی کے گندے پانی میں بھیگ کر کیچ ہو رہے تھے اور نیلی کچ ٹانگیں اکڑ کر اوپر کو اٹھی ہوئی نالی سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایک آنکھ جو پھول کر بدنمائی سے باہر ابلنے کے قریب تھی اس کی پتھرائی ہوئی مردہ روشنی بہت بھیانک تھی۔ مردہ کبوتر کو دیکھ کر میر نہال کو اپنے کبوتر یاد آنے لگے۔ کبھی انھیں کبوتروں کا شوق عشق کی حد تک تھا اور اپنے پرانے شوق کی پرانی یادان کے ذہن میں اجاگر ہو گئیں۔ جب وہ ایک گلی کے نکڑ پر مڑنے والے تھے کہ سامنے سے لوگ کسی کا جنازہ کندھوں پر لیے ہوئے آہستہ آہستہ آتے دکھائی دیے۔

میر نہال نے منہ ہی منہ میں کلمہ پڑھا اور میت کے ساتھ چالیس قدم گئے۔ جس دم کافور کی تازی تازی یاس انگیز خوشبو ان کی ناک میں بھکا بھک گھسی ہے تو ان کو وحشت سی ہونے لگی۔ سر گھومتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ قدم بڑھا کر یہ سوچتے ہوئے چلے کر آج ہی اپنی بیاض میں سے کوئی قبض کشا نسخہ نکال کر تیار کریں گے۔

ادھر میر نہال ڈیوڑھی میں داخل ہوئے ادھر نثار احمد نے مغرب کی اذان دی۔ انھوں نے جلدی جلدی وضو کیا اور بیٹھک میں فرش پر جا نماز بچھا کر نیت باندھ لی۔ گو سر سیسے کی طرح معلوم ہوتا تھا اور چکّر لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہے تھے مگر انھوں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا اور نماز میں مشغول رہے۔ لیکن رکوع کے بعد وہ جب

سجدے میں گئے، ہیں تو پھر سر نہ اٹھا سکے اور اچانک ایک طرف کو لڑھک گئے۔ ان کا پورا جسم بے جان معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ پیروں کی طاقت سلب ہو گئی تھی اور ان میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ خود اٹھ سکتے۔ انھوں نے کسی کو آواز دینی چاہی مگر نہ تو حلق سے آواز نکلتی تھی اور نہ زبان ساتھ دیتی تھی۔ وہ گنڈلی منڈلی بنے وہیں پڑے رہے۔

عفور جب ان کے لیے حقّہ تازہ کر کے اندر لایا تو اس نے میر نہال کو اُس عالم میں پڑا دیکھا۔ وہ گھبرا گیا اور انھیں اٹھانے دوڑا:

"سرکار کیسے ہیں؟ کیا ہوا؟"

لیکن میر نہال عفور کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ جب وہ نہ بولے نہ چالے تو عفور نے اکیلے ہی بڑی مشکل سے جیسے تیسے کھینچ تان کر انھیں پلنگ پر لٹایا اور رضائی اُڑھا دی۔ پھر ڈپٹین کو آواز دے کر بیگم نہال کو خبر کرائی اور خود سر پہ پیر رکھ کر حکیم اجمل خاں کو لینے بھاگا۔

حکیم اجمل خاں سنتے ہی عفور کے ساتھ آ گئے۔ میر نہال ابھی تک اُسی کروٹ پڑے تھے۔ انھوں نے نبض دیکھی اور نسخہ لکھا، پھر بولے:

"میر صاحب پر فالج کا اثر ہے مگر شکر کی بات ہے کہ بخار نہیں ہے — انشاء اللہ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

دلّی کے حکیم اپنی وضعداریوں میں بے عدیل تھے۔ آدھی رات کو بھی اگر کسی کو ضرورت پڑے تو وہ بلا عذر اسی وقت آ جاتے تھے اور علاج معالجہ تشخیص و تجویز کا قطعی معاوضہ نہ لیتے تھے بلکہ اس کو اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ دلّی والوں سے خصوصاً کبھی انھوں نے ایک پھوٹی کوڑی قبول نہ کی۔ بلکہ غریب غربا کا علاج مفت کرتے، دوائی ٹھنڈائی، ناداروں محتاجوں کو یونہی فراہم کرتے بلکہ بیسیوں مفلس مریضوں کے نام وظیفے اپنی گرہ سے جاری کر دیتے تھے۔

اجمل خاں کے جاتے ہی گھر کے سب لوگ میر نہال کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ بیگم نہال بہت پریشان اور فکرمند تھیں پیشانی کی شکنیں گہری ہو گئی تھیں اور وہ غور سے میاں کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پوچھتیں:

"اب جی کیسا ہے؟"

میر نہال کا حال اس وقت ابتر تھا۔ ان کی بنی سنوری ڈاڑھی کے بال بکھر گئے تھے تکلیف اور تناؤ سے آنکھیں اندر کو کھنچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ان کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ بیوی کی بات کا جواب دینے کی انتہائی کوشش کرتے مگر مفلوجی سے بے بس تھے۔ غنیمت ہے کہ فالج ایک حصہ پر گرا تھا اور وہ الٹے ہاتھ اور پیر کو حرکت دے سکتے تھے۔

کئی دنوں ان کی یہی کیفیت رہی۔ ایک پہلو سے پڑے پڑے اعضا میں اور اینٹھن ہوتی اور کئی راتیں اور کئی دن ان کو بے چینی اور بے قراری میں گزر گئے۔ حکیم صاحب کا نسخہ برابر پلایا جا رہا تھا۔ انھوں نے غذا میں کبوتر کی یخنی بتائی تھی۔ غفور روزانہ چوک جاتا اور یخنی کے واسطے کبوتر خرید کر لاتا یا دالان کے کارنس میں جن کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے انھیں مسرور پکڑ لیتا۔

مہینہ بیس روز بعد دواؤں نے اثر کیا اور وہ اس قابل ہوئے کہ ایک جملہ پوری طرح بول سکیں۔ مگر بات کر لینا ہی بڑی بات تھی گو ابھی وہ دوسروں کی مدد کے بغیر اٹھ بیٹھ تو نہ سکتے تھے۔ اس عرصے میں ان کے تمام ملاقاتی اور دوست احباب وقتاً فوقتاً آ کر حال پوچھتے رہتے اور ہر آنے والا کوئی نہ کوئی آزمودہ نسخہ ضرور بتا جاتا۔

ایک دن کمبل شاہ آ نکلے اور انھوں نے کہا:

"حضرت حکیمی علاج تو بہت کر چکے۔ ہمارے پاس بھی ایک فقیری نسخہ ہے۔"

333
427

میر نہال بولے،

"قبلہ آپ جو کچھ بتائیں میں کرنے کو تیار رہوں۔"

کمبل شاہ بولے:

"میر صاحب حواصل منگوا دیجئے، میں اس کا تیل خود تیار کروں گا۔"

اب اس کمبخت چڑیا کا دستیاب کرنا ہی ایک کارے دارد تھا۔۔۔ میر نہال نے عفور سے کہا اور وہ جا کر جامع مسجد کے تمام چڑی ماروں سے کہہ آیا۔ لیکن کئی دن چکّر لگانے کے بعد بھی کوئی چڑی مار ایسا نہ تھا جو حواصل مہیّا کر سکا ہو۔ کسی نے کہا موسم نہیں ہے، کسی نے کہا آدمی لانے کو بھیج رکھے ہیں۔ آخر کار حبیب الدین نے ہی نہ معلوم کہاں سے ایک حواصل پکڑوا کر منگوایا اور میر نہال کو کمبل شاہ کا انتظار رہنے لگا۔ کمبل شاہ فقیر آدمی تھے کوئی ان کا لگا بندھا ٹھکانہ تو تھا نہیں کہ حواصل آتے ہی ان کو بلوا لیا جاتا۔ لہٰذا ان کے انتظار میں حواصل کی ٹانگ میں غفور نے رسی باندھ کر صحن میں چھوڑ دیا اور بچوں کو ایک نیا اور دلچسپ کھیل ہاتھ آ گیا۔ وہ ادھر ادھر سے آتے اور اس کی لمبی چوڑی چونچ کو چھوتے۔ وہ اپنی زرد چونچ پوری کھولتا اور قرقر کی آواز حلق سے نکال کر چونچ زور سے بند کر لیتا۔ میر نہال اپنے پلنگ پر پڑے پڑے بچوں کو حواصل سے کھیلتا ہوا دیکھتے اور وہ اسی سے محظوظ ہو جاتے۔ انھوں نے زندگی بہرعنوان ہنس کر گزارنا سیکھ لیا اور مفلوجی کے شکنجے میں پھنس کر اپنی دائمی قید پر صبر کر لیا تھا۔

حواصل کا تیل تیار ہوتے ہوتے وقت لگ گیا اور جب وہ تیار ہو کر آیا ہے تو میر نہال کو پلنگ پر پڑے تین ماہ ہو چکے تھے۔ شمو خاں پہلوان روز آ کر حواصل کے تیل کی مالش گھنٹہ سوا گھنٹے تک کرتے اور اپنے استادانہ ہاتھ دکھاتے اور میر نہال کو پورے وثوق سے یقین دلاتے کہ اب کی جمعرات آپ اپنے پیروں پر کھڑے

ہو جائیں گے۔

"سرکار! آپ کی حالت تو کچھ بھی نہیں۔ میاں ایسے ایسے فالج والے جن کو حکیم اجمل خاں بھی جواب دے چکے تھے شمو خاں کی مالش سے چار دن میں قلانچیں بھرنے لگے!"

مگر پہلوان کی استادی اور کمال سے بھی کچھ افاقہ نہ ہوا اور بعض وقت وہ نہایت خستہ دل اور بیزار ہو جاتے لیکن پھر امیدیں اپنے چکمہ و فریب میں مبتلا کرتیں اور ہر شب وہ اس امید و یقین میں سو جاتے کہ کل جب صبح ہوگی اور وہ اٹھیں گے تو پہلے کی طرح تندرست و توانا ہوں گے۔ لیکن جب صبح ہوتی تو ناامیدی کی وہی تازہ کاریاں ہوتیں اور ان کے صبر و شکیب غارت ہو جاتے۔ اپنے قریب رکھے ہوئے پانی کے بھرے کٹورے کو دیکھتے اور ان کے جذباتِ خودداری کو ٹھیس لگتی اور یہ احساس ان کے دل و دماغ میں چٹکیاں بھرتا کہ وہ زندگی بھر کسی کے احسان مند نہ ہوئے تھے اور اپنے بیٹوں سے بھی اپنے واسطے روپے پیسے کے روادار نہ تھے اور اب وہ اتنے مجبور و لاچار ہو گئے تھے کہ پانی بھی ہاتھ بڑھا کر خود نہ پی سکتے تھے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

مہینوں طرح طرح کے تیلوں کی مالشیں ہوتی رہیں تب جا کر اتنا ہوا کہ وہ پلنگ سے اتر کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لکڑی ٹیک ٹیک کر تھوڑا سا چل پھر لیتے۔ جس دن پہلی بار انھوں نے پلنگ سے پاؤں نیچے اتارا ہے تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ زندگی میں دوبارہ زمین پر قدم رکھنا کس قدر مسرت خیز اور ایک گام چل لینا کتنا امید افزا تھا۔ جس طرح ایک گھٹنیوں چلنے والا بچہ پہلا پہلا قدم اٹھا کر خوش ہوتا ہے اسی طرح وہ اس انوکھی مسرت کے احساس سے دنوں خوش رہے۔

لیکن وقت کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ ایک ایک پہر صدیاں بن کر گزرتا۔ دن کا کاٹنا پہاڑ ہو جاتا۔ ہر نفس آزار تھا اور زندگی سنگلاخ۔ دن کے وقت

تو پردے کی وجہ سے بیگم نہال دیکھنے نہ آسکتی تھیں مگر رات کو ڈیوڑھی کے پھاٹک بند کرکے کنڈی لگا دی جاتی، اور بیگم نہال کے ساتھ جمال بیگم یا دوسری کنبہ کی بیویاں آ بیٹھتیں اور رات کا کچھ حصہ اس طرح باتوں میں کٹ جاتا۔

مگر بچھونے پر لیٹے لیٹے گرمیوں کے بے کیف لمبے لمبے دن کسی طرح کاٹے نہ کٹتے۔ دن بھر لو کے جھکڑ چلتے، خاک کے بگولے اٹھتے اور ان کے پلنگ کی چادر پر خاک کا بچھونا بچھ جاتا۔ ان کے پکے بال خاک آلود ہو جاتے، آنکھیں مٹی گھس کر کھٹکتیں اور وہ اپنے معطل وجود سے بیزار تنہا پڑے ہوئے اپنے مرنے کی دعائیں مانگتے۔ یہ بیزاری اس قدر بڑھتی کہ ان کا دل یہی چاہتا کہ کپڑے پھاڑ کر کہیں نکل جائیں اور بے بسی سے آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگتیں۔

بیکار پڑے پڑے انھوں نے آخرکار اپنے لیے ایک مشغلہ ڈھونڈ نکالا اور گھونسیں پکڑنی شروع کردیں۔ دلّی میں گھونسوں کی کمی نہ تھی۔ روز دو مارو تو دوسرے دن چار موجود۔ لہٰذا میر نہال نے اندر سے گھونس دان منگوا لیا۔ اس کی کھٹکی تو ٹوٹ چکی تھی لیکن دروازہ سلامت تھا۔ اس میں ڈوری بندھوا کر سرا اپنے پاس رکھتے اور غفور گھی چپڑی روٹی کا ٹکڑا یا ترکاری اس میں لگا کر گھونس دان موری کے قریب رکھ دیتا اور میر نہال بڑی محویت سے چپ چاپ گھونسوں کے انتظار میں لیٹے رہتے — جہاں گھونس اندر جاتی وہ ڈوری جلدی سے کھینچ لیتے اور پٹاک سے گھونس دان کا دروازہ بند ہو جاتا اور میر نہال اپنی فتحمندی پر اس طرح مسکراتے گویا شیر ببر کو پھانس لیا ہے اور غفور کو آواز لگاتے اور خوش ہو کر کہتے: — "پکڑ لی"۔ غفور کبھی ہنس دیتا اور کبھی بے دلی سے سن کر خاموش ہو جاتا اور اپنے دل ہی دل میں کہتا کہ سرکار اب سٹھیاتے جا رہے ہیں۔ مسرور کو بلوایا جاتا اور وہ موٹا سا ڈنڈا لے کر گھونس کو مار دیتا۔ دلچسپ بھی

اندر سے آجاتی اور گھونس مارنے کا تماشا دیکھتی اور جب وہ ادھر ادھر بھاگتی تو ٹھٹھا لگاتی۔

گھونسیں دن کو تو بھولے بھٹکے نکلا کرتی تھیں۔ البتہ رات کو سارے گھر میں کھڑبڑ کرتی پھرتیں۔ میر نہال کی راتیں تو مدتوں سے آنکھوں آنکھوں میں کٹ جایا کرتی تھیں لہٰذا وہ گھونس کے پھنس جانے کے انتظار میں لیٹے رہا کرتے اور جب کوئی شکار دام میں گرفتار ہو جاتا تو وہ خوش خوش سو جاتے۔ صبح کو غفور یا پھر مسرور اس کو مار دیتے۔ شمس تو ڈرتے تھے اور دور ہی سے تماشا دیکھا کرتے۔

ایک دن میر نہال حسب معمول لیٹے ہوئے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی اور بارہ کا عمل تھا۔ چلچلاتی دھوپ آنکھوں کو کھائے جاتی تھی۔ خاک کے بگولے چکر کھاتے ہوئے ہر طرف دھما ، اُڑا رہے تھے۔ اس تپش اور جھلسی ہوئی فضا میں پھیری والوں کی آوازیں کانوں کے پار ہوئی جاتی تھیں اور زندگی کی کوفت بڑھ کر نامحرومیوں کا احساس کر دیتی تھی۔ آسمان پر کبوتروں کی دو چار ہی ٹکڑیاں اڑ رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر میر نہال کو گزرے ہوئے دن یاد آ گئے اور وہ خوشی جو اب جدا ہو چکی تھی۔ اتفاقاً ان کی نظر کھجور کے درخت پر پڑی۔ اس کے سارے پتے ایک ایک کر کے مرجھا کر گر چکے تھے اور محض پھننگ پر دو چار پتے جو موسم کے سرد و گرم کی بیداد سے محفوظ رہ گئے تھے ہوا میں ادھر ادھر ہل رہے تھے۔ اس کا تنا بدہیئت ہو گیا تھا اور اس کے وہ گہرے بدنما نشان جہاں کبھی سرسبز و شاداب پتے اپنی بہاریں دکھا کر رخصت ہو گئے تھے وقت و واقعات کی المناک پرچھائیاں بن کر پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔

میر نہال گھونسدان کی ڈوری ہاتھ میں لیے لیٹے ہوئے تھے اور کبھی کبھی گھونسدان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ مگر گھونسیں بھی اب ہوشیار ہو گئی تھیں اور

انھوں نے آنا کم کردیا تھا۔ اتفاق سے ایک نیولن آگئی، اور روٹی کے ٹکڑے کو باہر سے سونگھنے لگی۔ اسے دیکھ کر میر نہال کو اس رات کی بھولی بسری یاد آگئی جب انھوں نے ایک ہی جھٹکے میں سانپ کو مار دیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ وہ موذیوں کو ہاتھ سے ہلاک کر دیا کرتے تھے اور آج وہ اتنے معذور ہو گئے تھے کہ پنجرے میں گھونسیں پکڑ کر ایک بیکار و مجہول زندگی گزارنے پر مجبور تھے، اور یہ جینا بھی کوئی جینا تھا۔

وہ ان ہی غم واندوہ کا شکار بنے لیٹے ہوئے تھے کہ نیولا بھی اپنے جوڑے کی تلاش میں آنکلا اور اپنی گردن کے بال پھلا پھلا کر اپنی مادین کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا محبت کی آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے نیولن گھونسدان میں گھس گئی۔ لیکن میر نہال نے ڈوری نہیں کھینچی۔ انھیں دفعتاً بنّن جان کا خیال آگیا جس کو موت نے عشق و محبت کی عین بھری بہار میں اپنے جنگل میں جکڑ لیا تھا۔ جب نیولن گھونسدان کے باہر نکل آئی تو میر نہال نے ڈوری کھینچ کر دروازہ بند کر دیا اور اس ذرا سی لذت۔ کہ دروازے جو انھیں اس سعیٔ بے حاصل میں ملتی تھی ہمیشہ ہمیشہ کو مقفل کر دیئے۔

اب سارے مشاغل ختم ہو کر غور و خوض کرنا ہی ان کا ایک مشغلہ رہ گیا اور وہ لیٹے لیٹے پہر دن زندگی کے پہلوؤں پر غور کرتے۔ زندگی کے نشیب و فراز، عروج و زوال کے تانے بانوں میں الجھے رہتے اور پھر زندگی کی شناوئیں انھیں اور زیادہ ستاتیں۔ وہ اس قدر بیزار ہو جاتے کہ ہر چیز وہم و گمان بن جاتی۔ کائنات کا وجود بے مقصد معلوم ہوتا اور کارخانۂ قدرت بے معنی اور نگاہ میں دنیا پھیکی پڑ جاتی۔ ہر شے بے مزہ ہو جاتی۔ آفاق کی گردشیں اور گیتی کی دھڑکنیں ان کے لیے بے کار تھیں۔ اور دہر کی اصلیت و ماہیت بے حقیقت۔ جب ہنگامۂ ہستی بے خروش ہو چکا تھا، راحت و سرور جا چکے تھے اور زندگی کا سب حسن کسی نے نچوڑ لیا تھا تو پھر اس جینے میں

کیا لطف باقی رہا تھا اور یونہی سوچتے سوچتے صبح سے شام ہو جاتی اور شام سے صبح۔ دن کے اجالے پھیلتے اور رات کی سیاہی بڑھتی۔ شب کی تاریکیوں میں کہیں دور رفتہ خوشیوں کی جھلملاتی شمع سے دھواں سا اٹھتا ہوا دکھائی دیتا اور سنسان دوپہروں کا سکوت گزری ہوئی حسین وجمیل زندگی کا غمناک فسانہ کہتا۔ خاک کے بگولے اُٹھتے رہتے اور ویران در۔ ویران فضا میں زندگی کا ہر واقعہ نذرِ خاک ہو جاتا مگر وقت کے ہمراہ زندگی بھی چلتی چلی جا رہی تھی۔

۱۰

میر نہال پہ فالج گرنا بیگم نہال کے لیے ایک سنگِ مصیبت سر سے گزر جانا تھا۔ میاں کے اس طرح معذور ہو جانے سے وہ کچھ ایسی بے کل اور خاموش ہو گئیں گویا دونوں ایک ہی ساز کے دو تار تھے اور ایک کے ٹوٹ جانے سے دوسرا بے مصرف ہو گیا۔ ان کے منہ سے غیر ارادی طور پر سرد آہیں نکلتیں اور وہ پہروں جانماز پر بیٹھی ہوئی اپنے میاں کے اچھے ہونے کی دعائیں مانگتیں۔ وقت کے ساتھ اعضا بھی انسان کی رفاقت چھوڑ دیتے ہیں۔ میر نہال کے دانت بھی جواب دے گئے۔ اور بیگم نہال ان کے واسطے روغنی روٹی یا نرم پھلکے خود پکاتیں اور قلیے میں چور کے بھیجتیں تاکہ وہ آسانی سے کھا سکیں۔ کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اب بیگم نہال کی اپنی آنکھیں جواب دے رہی تھیں۔ ایک دن رات کو چبوترے سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے چاروں خانے چت جا کر گریں۔ دلہن اور جمال بیگم نے دوڑ کر ان کو اٹھایا۔ جمال بیگم نے کہا،

"ہے ہے دلہن، اللہ نے بڑی خیر کرلی۔ کچھ لیا دیا سامنے آگیا۔ ارے بی چوٹ تو زیادہ نہیں آئی؟"
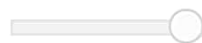
دلچین ان کی پیٹھ اور ٹانگیں جلدی جلدی سہلاتے ہوئے بولی :
"بیگم صاحب میں کل ہی حکیم کریم الدین بقا والے کو لے کر آؤں گی "
اور بیگم نہال نے کہا :
" نہیں بوا چوٹ تو نہیں آئی ۔ اب تو میں سچ مچ ہٹم ہوگئی ۔ اندھی دھندی زندگی دوزخ سے بدتر ہے "

دوسرے دن دلچین حکیم بقا والے کو بلا لائی ۔ انھوں نے موتیوں کا سرمہ اور سفید گولیاں دیں جو روز سنگ مرمر کی کھرل میں گھسی جاتیں اور گلاب میں حل کر کے سلائی آنکھوں میں پھرائی جاتی ۔ لیکن علاج کے باوجود بیگم نہال کی بینائی گھٹتی گئی چار و ناچار وہ لکڑی لے کر چلنے لگیں ۔ اب ان کا زیادہ وقت دالان میں بیٹھے بیٹھے گزر جاتا اور وہ کسنہ پھیلائے کتا کٹ چھالیہ کترا کرتیں اور بے نور آنکھوں سے سامنے تکتی رہتیں ۔ آنکھیں کیا گئیں کہ دنیا سے ناتا اور میل ملت ختم ہوگیا بس کبھی کبھار اصغر کے ہاں چلی جایا کرتیں جہاں آرا پانچ سال کی ہوگئی تھی اور ناک نقشہ ابھر کر بہت پیاری معلوم ہوتی تھی ۔
بلقیس کو کئی مہینے سے مستقل حرارت رہنے لگی تھی اور وہ اس عرصہ میں بہت لاغر اور دھان پان ہوگئی تھی ۔ اصغر کی اب بھی وہی پرانی روش تھی اور وہی بے اعتنا ئیاں ۔ مگر وہ پہلا سا چڑچڑا پن اور بے دردی سے پیش آنا کم ہوگیا تھا اور اس کی جگہ سرد مہری نے لے لی تھی ۔ اس نے گھر سے باہر دلچسپیاں ڈھونڈ لی تھیں ۔ نئے نئے جسموں کے چسکے پڑ گئے تھے اور دوسری عورتوں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے ۔ چونکہ اسے اپنی بیٹی سے درحقیقت انس تھا لہذا بلقیس کو جہاں آرا کی ماں سمجھ کر اس طرح قبول کر لیا تھا جیسے کوئی چیز نہ تو قابلِ توجہ ہوا ور نہ اس کو پھینکا جا سکے ، بس بیوی کی قدر و قیمت اتنی ہی تھی جو کسی انا دڈا کی ہوتی ہے ۔
بیگم شہباز کو ایک طرف داماد کے طرزِ عمل سے رنجش تھی تو دوسری طرف بیٹی کی

وجہ سے فکروتردد اور ہاتھوں نے اپنے امکان بھر بلقیس کی پرسش غم کی۔ ایک ماں جہاں تک اور جس طرح چارہ جوئی کر سکتی ہے۔ اس میں کمی نہ کی اور علاج معالجہ، تعویذ گنڈے ٹونے ٹوٹکے، سب ہی کچھ کرتی رہیں۔ ان کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اصغر نے بیوی کا پاپ کاٹنے کو جادو کروایا ہے تاکہ وہ مر جائے اور بیوی سے چھٹکارا پاکر تمام ذمہ داریوں سے بے نیاز آزادی سے رنگ رلیاں مناتا پھرے اور نئی جورو لے آئے۔

بیگم بہنال کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ اصغر اور دلہن میں ان بن ہے مگر وہ بیٹے کو مورد الزام نہ سمجھتی تھیں بلکہ جب بھی میاں بیوی میں ناچاقی کا ذکر آیا انھوں نے ہمیشہ یہ کہہ کر بہو کو قصوروار ٹھہرایا کہ "بی مرد تو سب ایسے ہی ہوتے ہیں مگر عورتیں ان کو بھگتتی ہیں۔ اور تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ بیویوں کی طرح بلقیس نے میرے بچے کا کونسا خیال رکھا اور خدمت کی۔ اس نے تو بہتیرا بیوی کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا مگر بلقیس ہی کوری بنی رہیں۔ ان کا کیا گیا میرا اصغر تو کہیں کا نہ رہا۔ بیوی کے کارن اس کی زندگی اکارت ہو گئی"۔ لیکن پھر بھی وہ بہو کو دسویں پندرھویں دن دیکھ آتیں اور سمدھن کو رائے دیتیں کہ فلانے حکیم کو بھی دکھا کر دیکھ لو۔ سنا ہے فلاں طبیب اچھا ہے اس کا نسخہ ملواؤ۔

بلقیس اندر ہی اندر گھل کر پہلے سے آدھی بھی نہ رہی تھی۔ رہی سہی قوت و ہمت بیماری نے چھین لی اور پچھلے چند دنوں میں وہ اس درجہ نحیف و کمزور ہو چکی تھی کہ اس کو ہاتھ ہلانا بھی دوبھر معلوم ہوتا۔ ہر وقت جسم بے جان اور ٹوٹا ٹوٹا رہتا اور اصغر اس کو لیٹا ہوا دیکھتا تو اب بھی اکثر پہلے کی طرح بگڑتا:

"خوب — تم نے یہ اچھا ڈھونگ رچایا ہے نہ وقت نہ دیلا تخت چڑھی کھیلا۔ نہ اٹھ کے گھر کو دیکھو نہ بچی کو۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ اور گھر میں ہر چیز الٹی پلٹی جیسے گدھے لوٹ رہے ہیں۔ آخر پھوہڑپن کی حد ہوتی ہے۔ میاں کی خبر تو تمہارے دشمن لیں، شادی

کر کے میں یہ سمجھی تھی کہ چلو آرام و خوشی ملے گی۔ یہ کیا معلوم تھا کہ رہا سہا سکون بھی جاتا رہیگا۔"
اور پھر وہ حسب عادت اپنی قسمت کا مزید شکوہ کرتا اور اپنے کو کوستا۔ بلقیس دم سادھے ساری ترش و تلخ سنتی رہتی۔

بلقیس سارا سارا دن دالان میں تنہا پلنگ پر پڑی کڑیوں کو گنا کرتی۔ دیواروں پر ڈراؤنی چھپکلیاں چپکی رہتیں اور ان کے لجلجے جسم دیکھ کر بلقیس کو وحشت ہوتی اور اس کو اکیلے گھر میں تنہا رہنے سے ڈر لگنے لگتا۔ اور شام کو جب سورج رخصت ہونے لگتا تو اس کی نحیف اور تھکی ماندی شعاعیں دروں میں سے ہوتی ہوئی پلنگ تک آجاتیں اور زرد زرد پھیکی دھوپ اس کے چہرے پر پڑتی اور دن کی آخری منزل کے ساتھ اس کو موت کا بھیانک خیال آجاتا اور وہ خوف سے پسینے پسینے ہوجاتی۔ ویسے اب تو اس پر موت کا خیال اکثر و بیشتر حاوی رہنے لگا تھا اور موت ہی اس کے لیے ایک ایسی امید تھی جو اس کے رنج و الم کو مٹا سکتی۔ لیکن جب اس کو جہاں آرا کا خیال آتا تو وہ مرنا بھی نہ چاہتی تھی۔ رہ رہ کر وہ یہی سوچتی رہتی کہ میرے مرنے کے بعد آخر اس معصوم جان کا کیا ہوگا۔ اصغر دوسری شادی کرلے گا اور سوتیلی ماں آکر اس پر ظلم و ستم توڑے گی۔ کون اس کا درد مند ہوکر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرے گا، اور میری غریب بچی مامتا کے لیے ترس جائے گی۔ کم از کم میری زندگی میں ماں باپ کی محبت شامل رہی ہے۔ اسے اپنے مرنے کا اتنا رنج نہ تھا جتنا بیٹی کی محرومیوں کا خیال اور ان افسردہ گھڑیوں کے درمیان اسے وہ حسین زمانہ یاد آجاتا جب شروع شروع اس کی شادی ہوئی تھی اور اصغر اسے چاہتا تھا۔ اسے چاہت کے مزے یاد آتے اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی اور وہ آنکھیں بند کر کے ماضی کے خیالوں میں سرگرداں ہوجاتی اور تلاش کرتی کہ محبت میں اسے اور کیا کیا ملا تھا۔ اسے اصغر کے محبت بھرے بوس و کنار یاد آنے لگتے اور اس لطف [illegible] شدہ کہیں سے باپ کی
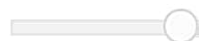
شفقت بھی آکر چپکے سے کھڑی ہو جاتی۔

وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی بھولے بسرے خوابوں کے تصور میں کھوئی رہتی۔ سورج چھپ جاتا اور رات بھی آجاتی۔ ستارے چمکتے اور ساری فضا ساکت ہو جاتی، اور اس سکوت میں بلقیس جہاں آرا کو بھینچ کر کلیجے سے لگا لیتی، اور رات کے سناٹے میں شب کے کناروں سے اس پار کہیں دور سکون و راحت کے نغمے آتے ہوئے سنائی دیتے۔ خوابوں میں اس کو ہنستے مسکراتے ہوئے لوگ نظر آتے جو اس سے نشاط و انبساط اور مہر و محبت کی باتیں کرتے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گل پوش مرغزاروں میں لے کر جاتے اور نغمہ ریز نہروں کے کنارے کنارے ٹہلتے۔ چونک کر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ رات کی تنہائیوں میں وہ تنہا ہوتی۔ جاگتے ہی وہ جہاں آرا کو اپنے سینے سے لگا لیتی اور شب کے سناٹوں کی سرگوشیاں اور اپنے دل کی دھک دھک سنتی رہتی۔

ایک رات کو اس نے بڑا بھیانک خواب دیکھا کہ وہ دریا میں نہا رہی ہے۔ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں جن کو وہ نہیں جانتی۔ وہ کنارے پر کھڑی ہو کر پانی میں غوطہ لگاتی اور پھر مزے سے خوشگوار لہروں کے بہاؤ پر مچھلی کی طرح تیرتی پھرتی، کبھی موجوں سے کھیلتی، ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھپکے لیتی، کبھی چلو بھر بھر کر چھینٹے اڑاتی۔ وہ بے فکری سے نہا رہی تھی کہ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اس کو پکار رہا ہے: "بلقیس بلقیس!" اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک شخص کھڑا ہوا اس کو انگلی کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا ہے جب وہ اس کے قریب گئی تو دیکھا کہ اصغر کھڑا ہوا ہے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اصغر کی شکل ایک بڈھے کی صورت میں بدل گئی جس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور موٹی کھال بالکل خشک اور گھناؤنی تھی۔ اس کی ناک پہاڑ کی طرح الگ رکھی ہوئی تھی اور دونوں نتھنے خوفناک غاروں کی طرح اندر کو دھنس کر عمیق اور تاریک نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی ایک آنکھ جو انتہائی

ڈراؤنی اور غضبناک تھی بلقیس کے چہرے پر جما دی اور ٹکٹکی باندھ کر لگا تار اس طرح گھورا کہ بلقیس کا دل دہل گیا، دہشت سے اس کے تن بدن میں سنسنیاں دوڑ گئیں، ہاتھ پاؤں برف ہو گئے اور وہ خوف سے بھنبھیری کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ ایکدم جاگ گئی۔ قلب کی رفتار تیز تھی اور دل کی دھڑکن کانوں میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے فطری جذبہ حفاظت سے جہاں آرا کو اپنی دلائی میں گھسا لیا اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اندھیرے میں چاروں طرف ہر چیز کو دیکھا۔ سکوت گہرا اور بے پایاں تھا۔ اس کی نیند اچاٹ ہو گئی اور خواب کی ڈراونی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ ہیبت سے اس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں۔ لیکن وہ خوفناک آدمی پھر اسی طرح نمودار ہو گیا۔

بلقیس سہم گئی اور ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر ماں کو آواز دی:

"امّاں، اے بی امّاں!"

بیگم شہباز جو بلقیس کی پٹی سے پٹی ملائے سو رہی تھیں، اُٹھ بیٹھیں اور بولیں:

"کیا ہوا بیٹی! خیر تو ہے؟"

"امّاں مجھے ڈر لگ رہا ہے، میرے پاس آ جائیے!"

بیگم شہباز کہنے لگیں:

"اے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔ آج شاید تم پڑھ کر نہ سوئی ہو گی!" اور اٹھ کر انھوں نے صراحی سے پانی کا کٹورہ بھرا اور بیٹی کو لا کر پانی پلایا۔ بلقیس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہتھیلیاں ابھی تک پسیجی ہوئی تھیں اور پیشانی پسینے سے تر تھی۔

اور اس خواب کے بعد دنوں وہ مہیب صورت سوتے جاگتے بلقیس کا تعاقب کرتی۔ جہاں اس کی آنکھ جھپکتی وہ غضبناک آنکھ اس کو گھورتی اور پہاڑ سی ناک

اور غاروں جیسے پر ہول نتھنے اس کو ڈراتے اور بلقیس کو یہی معلوم ہوتا کہ اس نے موت کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے جو اس کی گھات میں ہے اور کسی دن اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اپنے آہنی اور خاردار پنجے اس کے جسم میں پیوست کر دے گی اور اسے اپنی بھیانک آغوش میں دبوچ کر لے جائے گی۔

بیگم شہباز نے پیر جی کو بلوایا۔ وہ بوڑھے آدمی تھے۔ ان کی ڈاڑھی میں چند بال تھے جو ٹھوڑی کے بالکل نچلے حصے میں اُگے ہوئے تھے جن کی نوک بر بہے بکروں کی ڈاڑھی کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ نیلی لنگی پہنتے تھے اور سر پر نیلے رنگ کی پگڑی بندھی رہتی تھی۔ وہ روزانہ آکر سورۂ جن اور سورۂ مزمل پڑھ کر دم کرتے اور ڈاڑھی کے بالوں کو بل دے کر انگلی پر لپیٹتے ہوئے پورے یقین سے کہتے:

"ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ دنیا میں ہر طرح کی مخلوق بستی ہے۔ یہ خبیث روحیں ہوتی ہیں جو خواب میں آکر ستایا کرتی ہیں۔ لیکن سورۂ جن کے جلال کے آگے نہ بھوت ٹھہرے نہ پریت اور تم انشاء اللہ جلدی تندرست ہو جاؤ گی۔ وہ بڑا جبّار و قہّار ہے اور اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔"

پیر جی نے زعفران سے لکھ کر طشتریاں دیں جو بیگم شہباز کورے مٹکے کے پانی سے دھو کر روزانہ صبح شام بیٹی کو پلاتیں اور پھر دلاسے دے کر ہمت بندھاتیں:

"بیٹی اپنا اعتقاد ٹھیک رکھو۔ انشاء اللہ اس کے پینے سے دل ٹھہر جائے گا اللہ پہ بھروسہ رکھو۔ وہی شفا دینے والا ہے۔"

جھاڑ پھونک اور علاج معالجہ ہوتا رہا، مگر بلقیس کو معلوم تھا کہ یہ سب باتیں بے سود ہیں۔ اس کا مرض لا دوا ہو چکا تھا اور کسی کے پاس اس کے دکھ کا درماں نہ تھا۔ اس کو زندہ رہنے کی کوئی خواہش بھی نہ رہی تھی۔ موت اس جینے سے بدرجہا بہتر تھی۔ نہ اس دنیا میں ہوں گے نہ یہ رنج و غم رہیں گے۔ دوسری دنیا میں کم از کم زندگی

کی ابتلاء، پریشانیاں اور دنیا کی صعوبتوں سے تو نجات ہوگی۔ مگر اس کے مرجانے کے بعد اس کی بچی کا کیا حشر ہوگا؟ تمنائے مرگ اور زیست کے درمیان جہاں آرا کا خیال حائل ہوجاتا اور شاید بچی ہی وہ سپر تھی جس کے سہارے بلقیس اب تک موت کا مقابلہ کررہی تھی اور حیات کی تمام مایوسیوں اور ترشیوں کے باوجود زندہ رہنا چاہتی تھی۔

اکثر جہاں آرا کھیلتے کھیلتے اس کے پاس آتی اور گلے سے لپٹ جاتی اور منہ سے منہ ملا کر پوچھتی:

"امی آپ ہر وقت کیوں لیٹی رہتی ہیں؟ آپ مجھ سے کیوں نہیں کھیلتیں؟"
بلقیس کے دل میں ایک خنجر سا آرپار ہوجاتا۔ وہ بیٹی کے گال کو چومتی، ننھے ننھے ہاتھ آنکھوں سے لگاتی اور اس کا سر محبت سے تھپتھپا کر کہتی:
"امی کا جی اچھا نہیں ہے چاند جب امی اچھی ہوجائیں گی تو اپنی رانی بیٹی سے ہر وقت کھیلیں گی اور بہت سی گڑیاں سی کردیں گی۔ سمجھیں؟" اور پھر وہ اس کو پیار کرتی اور پیٹھ سہلا کر سمجھاتی: "میری بنّو بہت پیاری ہے۔ اور دیکھو تو بیٹی تم ابّا کو مت ستایا کرو۔ تم بڑی سمجھدار اور نیک بچّی ہو۔ اچھے بچّے ابّا کو بہت پیار کرتے ہیں اور ان کا کہا مانتے ہیں۔"
اور پھر اپنی طرف سے بچّی کا دھیان بٹانے کو وہ اسے بہلا کر کسی کھیل میں لگا دیتی اور جب جہاں آرا کھیل میں مصروف ہوجاتی تو اس کو دیکھ دیکھ کر گھنٹوں روتی رہتی۔ اور اس عرصہ میں کون کون جان لیوا خیال آکر اس کی ہمت اور قوت کو توڑ دیتے۔ اور جب بیٹی کو چھوڑ جانے کا ملال موت کے خیال سے زیادہ سخت اور آزار جاں ہوگیا تو ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہا:
"اچھی، امّاں میں ایک بات کہوں، مانو گی نا؟"

بیگم شہباز بولیں،

"کہو تو سہی ماننے کی ہوئی تو مان لوں گی۔"

بلقیس نے جواب دیا؛

"نہیں پہلے تم مجھ سے پکّا وعدہ کرو۔"

بیگم شہباز بولیں؛

"بیٹی تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ کیا قرآن اٹھواؤ گی؟ میں نے کب تمہارا کہا نہیں کیا۔"

"امّاں تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میں اگر مر گئی تو تم جہاں آرا کو اپنے پاس رکھّو گی!"

بیگم شہباز کو یہ سان و گمان بھی نہ تھا کہ بیٹی اس قسم کی التجا کرے گی اور وہ اچانک گھبرا کر بولیں؛

"ہے ہے بلقیس! بیٹی تم کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے حواسوں پر سے صدقہ دو۔ اللہ تمہیں رکھے، اپنی بچی کی خوشیاں دیکھو۔ اوئی ذرا سے بخار میں دل چھوٹا کر بیٹھیں۔ نوج، مریں تمہارے دشمن اور برا چاہنے والے۔"

"امّاں! مرنا تو سب کو ایک دن ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ پانی کا بلبلہ ہے۔"

"پرے ہٹاؤ ایسے نامراد خیالوں کو۔ تمہیں آخر ہوا کیا ہے۔ خاصی اچھی بھلی چنگی ہو۔ ذرا سی کمزوری ہے جاتی رہے گی۔"

مگر بلقیس نے ان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے پھر زور دے کر کہا:

"اچھی میری امّاں! بس تم مجھ سے وعدہ کر لو۔ میں چین سے مر جاؤں گی ورنہ بچّی میں دل پڑا رہے گا اور میری روح تڑپتی رہے گی۔"

بیگم شہباز یہ تو نہیں کہ جذبات سے بالکل عاری تھیں اور خاشبہ [illegible]

بے حد چاہتی تھیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بلا وجہ اپنی جان کو روگ لگانے کی قطعاً روادار نہ تھیں۔ آئی کو تو کوئی ٹال نہیں سکتا، پھر ہلکان ہونے سے فائدہ؟ دو روز کی زندگی میں کیوں اپنی زندگی اجیرن کی۔ اس نظریہ کے تحت جب ان کے میاں مر گئے اور وہ بیوہ ہو گئیں جب بھی انھوں نے چوڑی چھلے اور اچھے کپڑے پہننے میں کوتاہی نہ کی اور ہمیشہ یہی کہا کہ مرنے والے کے ساتھ کوئی خود مر تو نہیں جاتے، کیا کوئی دنیا کو تیاگ دے؟ اپنی ذات ان کو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی اور اپنے سود و زیاں، آرام و آسایش کے آگے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ مگر چاہے وہ خود سے کتنی ہی محبت کرتی ہوں، تھیں تو ماں۔ اور ماں کا دل پھر ماں کا دل ہے۔ وہ بیٹیوں کا کسی حالت میں دل توڑنا نہیں چاہتی تھیں، نہ آزردہ کرنا۔ اب ان کے پاس رہ کون گیا تھا۔ ایک بڑی بیٹی پردیس باسی تھی، ہندوراسیور میں اور زہرہ کم عمر تھی۔ بیٹی شادی کے بعد سے اب تک ان کے پاس رہی اور اماں سے بے پناہ محبت کرنے کے علاوہ وہ ان کی ہر بات کا خیال رکھتی تھی اور انھیں یہ علت تھی کہ یا تو کوئی ان پر نچھاور ہوتا رہے یا پھر کوئی ان کی توجہ کا محتاج رہے۔ اس بنا پر وہ اکثر جھوٹ موٹ مرض گھڑ لیا کرتی تھیں تاکہ لوگ انھیں اسی بہانے پوچھ لیا کریں اور ہمدردیاں جتائیں۔ اور ایک ذرا سا وعدہ کر لینے میں حرج بھی کیا تھا وہ مزید فکر و پریشانی کی دردِ سری سے بچ جاتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے بیٹی سے وعدہ کر لیا،

"بیٹی تم مت گھبراؤ۔ میں آخر کو نانی ہوں۔ نواسے نواسی اپنی اولاد سے پیارے ہوتے ہیں۔ مگر میں کہتی ہوں تم یہ وہم دل سے نکالو۔ انشاء اللہ جیتے ہاتھ پیروں سے اٹھ کھڑی ہو کر خود اپنی بچی کا سب کچھ کرو گی۔ تم اطمینان رکھو جہاں آرا مجھ کو جان سے عزیز ہے۔ جب تک دم میں دم ہے اس کا بال بیکا نہ ہو گا۔ اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔"

۱۱

جنوری کا مہینہ تھا۔ مہاوٹیں شروع ہوگئی تھیں۔ بارش ابھی تھمی تھی۔ باہر خوب تیز اور برفانی ہوا چل رہی تھی۔ جہاں آرا دن بھر کھیل میں تھک کر سرِ شام ہی سے سو چکی تھی۔ بیگم شہباز دوسرے دالان میں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں اور ملقیس اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی خاموشی سے چھت کو تک رہی تھی۔ سرہانے رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور پلکوں کے دراز سائے میں نقاہت سے ڈگر ڈگر کرتی ہوئی اس کی بڑی بڑی آنکھیں نرگس کی طرح سفید دکھائی دیتی تھیں۔ اتنے عرصے کی بیماری سے وہ ناتواں ہوگئی تھی اور اس کا گدرایا ہوا خوبصورت جسم کملا گیا تھا۔

نہ معلوم آج اصغر کے جی میں کیا آئی کہ وہ اپنے کمرے میں سے اٹھ کر ملقیس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ نکھرے ہوئے دھلے دھلائے شفاف آسمان پر ابر کے ٹکڑے دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑ تے تھے۔ ماہِ نو ان سے اٹھکھیلیاں کر رہا تھا، کبھی بادلوں کے دامن میں چھپ جاتا اور کبھی باہر نکل آتا کہیں

کہیں جگمگاتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ بھاگتے ہوئے بادلوں میں سے مسکراتے ہوئے نظر آجاتے جو مہاوٹ کی بھیگی ہوئی رات کو درخشاں و دلفریب بنا رہے تھے۔

قریب ہی گلی میں کوئی لڑکا نئی غزل مزے لے لے کر گا رہا تھا:

مجھے مسیحا کے احسان سے بچا لینا
تم ہی نے درد دیا ہے تم ہی دوا دینا
میری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغِ گورِ غریباں صبا بجھا دینا

گانے کی آواز ہواؤں کے ساتھ دور جا کر رات کی فضاؤں میں ڈوب گئی۔
اور ایک زمانہ گزر جانے کے بعد آج اصغر کے دل میں محبت کی وہی پرانی کسک تھی اور عشق کی وہی چبھن اور روح کسی رفتہ درد و خلش کو لے کر پھر بیدار ہو گئی تھی اور گم گشتہ محبت و الفت کی دیرینہ یادیں تحت الشعور کے پردے چاک کرتی ہوئی ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ اس نے بلقیس کے کملائے ہوئے چہرے کو نظر بھر کے دیکھا اور اس کے ضمیر نے چیخ کر اس کی زیادتیاں اور بے انصافیاں جتا کر اسے قصور وار ٹھہرایا اور اصغر اپنی سنگدلی پر پشیمان ہونے لگا، لیکن دل محبت سے خالی تھا۔ اور اصغر سوچنے لگا کہ وہ بلقیس سے محبت کیوں کرنے لگا تھا اور جب محبت کی تھی تو پھر کس واسطے اتنے تغافل اور بے رخی سے پیش آیا۔ حالانکہ وہ مجھ کو دل و جان سے چاہتی ہے مگر میں نے اس کی محبت کا جواب محبت سے کیوں نہ دیا؟ جب محبت کی لگن بلقیس کے دل کو جلا رہی تھی لہٰذا اس کے شعلوں نے مجھے کیوں نہ جلایا؟ یہ عشق کے جواز کیا ہیں اور محبت کے رمز کیسے؟ کیا عشق کو بھی اظہارِ عشق کی ضرورت ہے اور ایک عورت سے

محبت صرف اس کے جسم کی خاطر کی جاتی ہے اور اس کے حسنِ باطنی وزیبائی اور غمزہ وناز سے محبت کو سروکار نہیں ہے اور عشق محض داستانِ ہجر وفراق دوہرانے تک ہے؟ مگر پھر یہ پروانے جو شمع کے گرد دیوانہ وار طواف کرتے ہیں اور وارفتگیٔ شوق میں فنا ہو جاتے ہیں تو کیوں؟ حسن کی تمنا کس کو نہیں ہوتی اور وہ بھی طالبِ نور وضیا ہیں اور حسن کے عاشق اور حسن ہی پر اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ کیا بلقیس بھی مجھ پہ پروانہ وار عاشق نہ تھی اور میرے لیے اس نے اپنے کو مٹایا نہیں؟
اس وقت وہ اپنی بے مہریوں پر منفعل اور نادم بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بلقیس کا یہ حشر اس کی غفلتوں کا نتیجہ ہے اور اب وہ اپنی بے پروا ہیوں کے بدلے بلقیس کی محبت کا صلہ خلوص ووفا سے چکائے گا۔
بلقیس اسی طرح لیٹی رہی۔ غزل اس کے اتنے حسبِ حال تھی کہ اس کو اپنی زبوں حالی پہ رونا آگیا۔ اور دھیرے سے اصغر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کہیں دور خیالوں میں کھوئی ہوئی بولی؛
"آپ میرے لیے مطلق پریشان نہ ہوں۔ اب میں زیادہ نہیں جیوں گی۔ میں اپنے مہر سے آزاد کرتی ہوں۔ میرے بعد آپ ضرور شادی کر لیجیے گا۔"
یہ کہہ کر اس نے اصغر کا ہاتھ محبت سے دبایا پھر رسان سے چھوڑ دیا اور اصغر کو کچھ اس طرح پرستارانہ نگاہوں سے دیکھا کہ اس کا دل بھر آیا اور ہونٹ جذبات سے کانپنے لگے اور وہ اس کے ہاتھ کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولا؛
"تم ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تم جلدی تندرست ہو جاؤ گی اور پھر ہم تم دونوں مل کر ہنسی خوشی رہیں گے۔ کل صبح میں ڈاکٹر کو لا کر دکھاؤں گا۔ گھبرانے اور دل چھوڑنے کی بات نہیں۔"
اس نے بلقیس کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا اور دو گرم گرم آنسو اس کے

گانوں پر گر گئے۔ بادلوں کے پیچھے بجلی کوندی اور اس کی چمک سے آسمان روشن ہوگیا۔
اصغر نے بلقیس کو دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ اس بیماری اور لاغری کے باوجود وہ کتنی حسین تھی۔ اس کے خط و خال کتنے سبک اور نازک تھے اور اس کی سادگی میں اب بھی تیکھا پن تھا۔ اور اصغر کو یہ محسوس ہوا کہ دراصل اسے بلقیس سے محبت آج بھی ہے اور محبت کے خیال کے ساتھ یہ خدشہ اس کا کلیجہ نوچنے لگا کہ اگر بلقیس نہ رہی تو اس دنیا میں وہ اکیلا رہ جائے گا۔ اور اس نے بہت عاجزی اور راست بازی سے کہا:

"بلقیس تم میری کوتاہیوں کو معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تم پر سراسر ظلم کیے ہیں۔ تمہارا میں سزاوار ہوں"

بلقیس نے کٹیرہ سی آنکھیں اٹھا کر جو محبت کی نرمی اور گرمی سے مسکرا رہی تھیں اصغر کو دیکھا۔

"آپ ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ آپ نے کوئی ظلم نہیں کیے آپ بے قصور ہیں۔ یہ سب میری خطائیں تھیں...."

عشق کے اعجاز انوکھے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ذرا سی پرسشِ غم محبت میں ہار جانے والوں کی یوں مسیحائی کر دیتی ہے کہ مدتوں کے پڑے ہوئے دل کے گھاؤ خود بخود بھر جاتے ہیں۔ اور اصغر کا تجدید محبت کرنا تھا کہ بلقیس کے جی کی ساری جلن مٹ گئی اور اس کے قلب میں زندہ رہنے کی خواہش تڑپنے لگی اور اس وقت اس کا دل یہی چاہتا تھا کہ کسی دیوداسی کی طرح وہ اپنے دیوتا کے چرنوں میں گر جائے......

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

صبح اصغر ڈاکٹر مترا کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے بلقیس کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور اصغر سے انگریزی میں کہنے لگا کہ یہ تپِ دق کی مریضہ ہیں، لیکن مرض ابھی پرانا نہیں

ہوا ہے اگر مریض کی صحیح دیکھ بھال ہو اور اچھی غذا اور آرام ملے تو ضرور ٹھیک ہو جائیں گی
تپ دق کا سن کر اصغر کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ ڈاکٹر نے مزید ہدایتیں دے کر دواؤں
کا لمبا چوڑا نسخہ لکھ کر اصغر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور بیگم شہباز نے میاں بیوی کا میل ملاپ دیکھ کر
شکرانے کے دوگانے ادا کیے۔ بیگم شہباز ابھی تک معمولی بخار کا حکیمی نسخہ پلا رہی تھیں
مگر جب ڈاکٹر کے ہاں سے دوائیں لے کر اصغر واپس آیا تو اس نے اس کو بلقیس کے مرض کی
نوعیت بتائی۔ سنتے ہی ان کا دل سن سے رہ گیا اور انھوں نے اسی شام کو پیر جی کو
بلوا کر اور نئے تعویذ لکھوائے اور سارے بزرگوں کی نذر و نیاز یں مانیں اور خدا کی
بارگاہ میں گود پھیلا پھیلا کر حبیبؐ کے واسطے دیتیں اور بیٹی کے تندرست ہو جانے کی
التجا کرتی رہیں۔

بلقیس کی عیادت کو جو ملنے جلنے والی اور رشتہ دار بیویاں آتیں کوئی نہ کوئی
چٹکی بٹکی بتا جاتیں۔ کوئی رائے دیتی :

" اے بی حکیم بھینسوں والے کو بلا کر دکھاؤ، ان کے ہاتھ میں اللہ نے بڑی
شفا دی ہے۔ ہمارے محلّے میں جو شاہ جی رہتے تھے ان کی بہو تو بس کھٹیا سے لگ
گئی تھیں، آدھے دھڑ کی جان نکل چکی تھی ان کی دوروز کی ٹھنڈائی سے سارا دکھ جاتا رہا
تو وہ اب تک ایسی ہنستی کھیلتی ہے کہ بی آج تک چھینک بھی نہیں آئی۔"

ایک کہتیں: " بوا ان ڈاکٹروں کی باتوں میں کیا دھرا ہے۔ رائی کا پربت
بنا دیتے ہیں۔ بس ٹیکے سید ھے کرنے کو رنگ گھولا اور شیشی میں دے دیا۔ اب تم
یقین کرنا میری سمدھن کے بھائی کی سالی کی بیٹی کو بھی موئے حکیم ڈاکٹروں نے یہی نگوڑی
ماری لمبی بیماری بتائی تھی۔ لیکن خدا کی قدرت ایک فقیر آنکلے۔ انھوں نے بس جو برابر
ایک دوائی کھلوائی۔ تو بیوی اس کا کھانا تھا کہ اس لڑکی کا جی ہرا ہوا اور وہ قے

ہوئی کہ سلیپیاں کی سلیپیاں بھر گئیں اور پتّے کا پانی تک نکل گیا۔ اب جو آخری ابکائی آئی اس کے ساتھ کلبل کلبل کرتا ہوا دق کا کیڑا باہر آگیا۔ ہم سب نے دیکھا تھا اور پھر تو اس لڑکی کے چہرے پر وہ رنگ دوڑا کر دیکھے سے نظر لگتی تھی۔"

بیگم شہباز کی تو جان پر بنی ہوئی تھی اور ان کا بس چلتا تو جو کوئی اگر جو کچھ بتا جاتا سب بلقیس کو کھلا دیتیں۔ ممکن ہے کوئی دوا لگ جائے۔ لیکن اصغر نے منع کر دیا تھا کہ سوائے ڈاکٹر مترا کے علاج کے اور کسی کی بتائی ہوئی کوئی دوا دوا نہیں دی جائے گی۔ رہے تعویذ گنڈے تو وہ اور بات تھی۔

فروری سے لے کر مارچ تک موسم بہت خوشگوار اور گلابی رہا۔ بلقیس کو اچھی غذا اور پورا آرام ملا اور پھر اصغر پوری توجہ سے اس کی تیمارداری میں لگا رہتا تھا ایک مہینہ ہی میں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پہ پانی پھر گیا اور بیماری آدھی بھی نہ رہی۔ نقشہ بدل چکا تھا، فضا سازگار تھی اور محبت کے فیض و کرم شامل حال۔